JAF & CO.
Plot # 43/4 Q-2, Block-6,
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

دوست

GOVT. GIRLS HIGH SCHOOL
No. 3926/N. 763
Date: 27-11-61
CENT. PAK. • KARACHI. • LIBRARY

از قلم
جناب سید رئیس احمد جعفری

TAHER BOOK DEPOT
Saddar
KARACHI-3.

ناجران
مکتبۂ معین الادب اُردو بازار لاہور

ناشران	پرنٹرز پبلشرز	ایم معین الدین محمد حلیم
	مطبع	نقوش پریس لاہور
مکتبہ خاور، چوک مینار۔ لاہور	گردپوش	جناب اشرف آرٹسٹ
	تعداد اشاعت	۱۰۰۰
	قیمت	چار روپے

(۱)

اسلامی انقلاب

اسلام نے عربوں میں ایک نئی زندگی پیدا کردی

جب تک انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں موجود نہ ہو۔ وہ شراب پیتے تھے۔ زناکاری سے انھیں اجتناب نہ تھا۔ جُوا اُن کا بہترین مشغلہ تھا۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار دے غیرت کے زمین میں جیتے جی دفن کر دیتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر تلوار میان سے نکل آتی اور اُس وقت تک واپس نہیں جاتی تھی جب تک خون کے دریا نہ بہا لے۔ بُت پرستی عربوں کا قومی مذہب تھا۔ وہ ایک دو نہیں، تین سو ساٹھ بتوں کی پُوجا کرتے تھے۔ اور اپنے اس مذہب سے بہت مطمئن تھے۔

لیکن اسلام نے اُن کے اندر ایک عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیا۔ ایسا

انقلاب جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد یہ عرب بالکل بدل گئے۔ پہلے یہ بات بات پر لڑتے تھے اب ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے۔ پہلے یہ بُت پرست تھے۔ اب ایک خدا کے سامنے سربسجود ہوکر، ساری دنیا سے، دنیا کی ہر طاقت سے، بادشاہوں، سپہ سالاروں، زمداروں اور کافروں کے مقابلہ میں صف آرا ہوگئے۔ اب وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ بددیانت تھے، اب امین ہوگئے جھوٹ کے خوگر تھے۔ اب سچ بولنا ان کا شیوہ تھا۔ عہد شکن تھے۔ لیکن اب قول و قرار کو جان سے زیادہ عزیز رکھنے لگے۔ شراب کے رسیا تھے۔ لیکن اب اُن سے بڑھ کر زاہد کوئی نہیں تھا۔ حقوق مار لینے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور اب یہ حالت تھی کہ کسی کا حق مارنا وہ بدترین گناہ سمجھتے تھے۔

اس انقلاب نے عربوں کا پایہ بہت اُونچا کر دیا۔

جب تک وہ برائیوں کے پیکر تھے ذلیل اور ناکام تھے۔ ایران سے بھی دبے ہوئے تھے اور روم سے بھی۔ وہ قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نہ ان کی حکومت تھی نہ نظام حیات۔ وہ اگرچہ باقاعدہ کسی کے غلام نہیں تھے لیکن ان کی زندگی غلامی ہی کی زندگی تھی۔ ہر چیز میں وہ دوسروں کے محتاج تھے۔ ہر معاملہ میں وہ اغیار کے دست نگر تھے۔ قیصر روم انھیں حقیر ترین مخلوق سمجھتا تھا۔ اور کسریٰ ایران اپنی معمولی رعایا۔

اور جب اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا ——— ؟

تو حالت یہ ہوگئی کہ

"رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا"

وہ عرب کے تنگنائے سے باہر نکلے۔ اور ساری دُنیا پر چھا گئے۔ اُنھوں نے ایران کی شہنشاہی ختم کر دی۔ اُنھوں نے روم کے قیصر کو بار بار راہ فرار اختیار کرنے اور جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے بحر و بر پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ وہ جس طرف بڑھے کامیابی اُن کے ساتھ ساتھ چلی۔ ایران زیر ہو گیا۔ مصر اُن کا کلمہ پڑھنے لگا۔ شام اُن کے پرچم تلے آگیا۔ عراق نے ان کی فرماں روائی کے آگے سر جھکا دیا۔ خراسان ان کے ماتحت ہو گیا۔ بربر پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ افغانستان کی پہاڑیوں پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔

دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے وہ ٹکرائے لیکن شکست و ہزیمت سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ جہاں گئے فتح و کامرانی نے اُن کے قدم چومے۔ جس طرف رُخ کیا، بڑھتے ہی چلے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ مختصر سی مدت میں وہ دنیا کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ وہ کسی ملک میں تلوار لے کر داخل نہیں ہوئے تلوار صرف اُس وقت چمکتی تھی جب تلوار سے ان کا مقابلہ کیا جاتا تھا۔ ورنہ اُن کے ہاتھ میں قرآن تھا۔ اور ان کی زندگی قرآن کی تفسیر تھی۔ اس لیے وہ جہاں پہنچتے تھے وہاں اسلام تیزی سے پھیلنے لگتا تھا۔

عربوں کی رعایا میں بہت بڑی تعداد اگر چہ ایسے لوگوں کی تھی جس نے عربوں کی ماتحتی قبول کر لی تھی لیکن اسلام اور قرآن سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ بُتوں کو پوجتے تھے۔ کلیساؤں اور گرجاؤں میں عبادت کرتے تھے اور عرب ان کے مذہبی معاملات میں بالکل مداخلت نہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو آزادی

دے دی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہے۔ اپنے رسم و رواج پر عمل کرے اپنے قانونِ وراثت کو نافذ کرے۔ غیر مسلموں کو یہاں تک اجازت تھی کہ وہ ان تمام معاملات کا تصفیہ اپنے مذہبی اور قومی رہنماؤں کے ذریعے کریں جو آپس کے معاملات سے متعلق ہوں۔ البتہ جب مقدمات میں مسلم اور غیر مسلم ساتھ ساتھ فریق کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مسلم عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ اور وہاں بھی حالت یہ تھی۔ کہ غیر مسلم کے ساتھ اس لیے ناانصافی نہیں ہوتی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا جاتا تھا۔ جو انعام کا مستحق ہوتا تھا اُسے انعام ملتا تھا۔ جو سزا کا مستوجب ہوتا تھا۔ وہ سزا پاتا تھا، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

مسلمانوں کی اس رواداری اور عالی حوصلگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی اور یہودی اپنے اپنے علاقوں سے بھاگ بھاگ کر مسلم علاقوں میں آباد ہوتے۔ وہاں انھیں بہت رشوت دینا پڑتی تھی۔ بیگار میں مبتلا اور ادنیٰ نیچ کا شکار ہونا پڑتا تھا غربت اور ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ محاصل ادا کرنے پڑتے تھے۔ اور یہاں ان تمام باتوں سے انھیں یکسر نجات مل جاتی تھی۔ رشوت نہ کوئی مانگتا تھا۔ نہ دینا پڑتی تھی۔ انصاف بہت سستا اور عام تھا۔ سوا ایک بہت معمولی رقم جزیہ کے کوئی اور محصول ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اور یہ رقم اتنی معمولی تھی کہ ایک فقیر بھی آسانی سے ادا کر سکتا تھا۔ بیگار کا یہاں کوئی نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔ مسلمان مساوات اسلامی کے نہیں مساوات انسانی کے قائل تھے۔ ان کے ہاں اونچ نیچ قطعاً نہیں تھی۔ وہ سب کو برابر سمجھتے تھے۔ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے مسلمان سے اس لیے کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ کہ وہ مسلمان

تھے۔ جس طرح مسجد میں ہر مسلمان جہاں چاہے بیٹھ سکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی عدالت میں جو شخص جب چاہے آ سکتا تھا۔ اس ہیئت کو دیکھ کر غیر مسلموں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اور وہ بڑی خوشی سے مسلمانوں کے ماتحت زندگی بسر کرتے تھے

صرف یہی نہیں، نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ کہ اگر کبھی مسلم حکومت اور عیسائی مذہب میں جنگ و جدل کی نوبت آتی تھی تو یہ عیسائی رعایا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر خدا سے دعا کرتی تھی کہ مسلمانوں کو فتح ہو اور عیسائی ہار جائیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے تھے۔ کہ عیسائی اگر فتحیاب ہوئے تو انھیں پھر ننگِ انسانیت مظالم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور مسلمان اگر جیتے تو وہ امن اور سکون و عافیت کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ وہ اس وجہ سے مذہب کو ایک نجی مسئلہ سمجھنے لگے تھے۔ مگر اور حکومت کو ایک دوسرا معاملہ۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ عیسائی حکومت ان کے دکھ کی دوا نہیں بنتی۔ اور انھیں اور زیادہ ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان کی رگ رگ سے خون چوس لیتی ہے۔ اس کے برعکس مسلم حکومت انھیں زیادہ سے زیادہ سہولت اور آسائش عطا کرتی ہے۔ اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہونے دیتی۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی حکومت میں اپنے مذہب پر عمل کرتے رہیں۔ تاکہ دُنیا بھی ہاتھ سے نہ جا سکے۔ اور دین میں بھی اُنھیں توڑا نہ ہو۔

اس عیسائی اور غیر مسلم رعایا کو معلوم تھا کہ ایک غیر مسلم یہ حق تک رکھتا ہے کہ قاضی کی عدالت میں خلیفۂ وقت کے خلاف مقدمہ دائر کرے۔ اور قاضی کے انصاف کا یہ عالم ہے کہ وہ خلیفۂ وقت کے خلاف بے تامل فیصلہ دے دیتا ہے اپنی عیسائی حکومت میں وہ اتنا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے بادشاہ کے

خلاف مقدمہ چلانا تو بڑی چیز ہے۔ لب کشائی کی جرأت بھی کر سکیں۔

جب تک خلافت راشدہ کا دور رہا مسلمان ہر اعتبار سے بلند اور برتر تھے پھر جب یہ دور مبارک ختم ہوا اور خلافت کے بجائے مسلمانوں میں بادشاہت اور شخصی حکومت کا رواج ہوا تب بھی حالت یہ تھی کہ مسلمان ملوک و سلاطین ہیں اور دوسرے قسم کے چاہے جتنے نقائص ہوں، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے وہ خواہ کتنی ہی کمزوریوں کے حامل ہوں۔ لیکن اس دور میں بھی غیر مسلموں کے لیے وہ رحمت ہی رحمت تھے۔ یہ مسلمان بادشاہ مسلمانوں پر ظلم کر لیتے تھے۔ لیکن غیر مسلموں سے رواداری، ان کی اس طرح فطرت بن چکی تھی۔ کہ انھیں کبھی نہیں ستاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ بعض بڑے ظالم اور سفاک بادشاہ بھی جن کے خونین کارناموں کے ذکر سے تاریخ کے اوراق لال ہو رہے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں پر مسلمان ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ سختی کرتے تھے، لیکن کیا مجال جو اُن کے دورِ حکومت میں کسی غیر مسلم کو ظلم و ستم کا ہدف بنایا جا سکے۔

عیسائی اور یہودی اس حقیقت کو اچھی طرح جان گئے تھے، اسی لیے وہ اسلامی حکومتوں کے انقلاب سے بالکل متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ان بادشاہوں کے آنے جانے کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ کوئی بھی آئے کسی خاندان کی حکومت ہو۔ انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ وہ اسی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ اور یہ صرف اُن کی خوش عقیدگی نہیں تھی۔ امر واقعہ تھا، جس کی گواہ تاریخ ہے۔ اور تاریخ کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

(۲)

عقدِ ثانی کا مشورہ

عرب حکومت کی توسیع کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں میں عرب نوآبادیاں بھی قائم ہوتی گئیں۔ بہت سے حوصلہ مند عرب دیارِ وطن سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر عرب مملکت کے مختلف علاقوں میں آکر بس گئے۔ اور مختلف مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ ان نوآبادکار عربوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ وہ بھی تھے جو سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور وہ بھی جو کاروبار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

مرو یوں تو ایران کا ایک حصہ تھا، لیکن یہاں بھی متعدد عرب خاندان آکر بس گئے تھے۔ اُن میں سے ایک خاندان کا سربراہ زید تھا۔ یہ ایک اولوالعزم اور حوصلہ مند عرب تھا۔ مذہبی جوش سے بھرپور، کئی جنگوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اس

خلاف مقدمہ چلانا تو بڑی چیز ہے۔ لب کشائی کی جرأت بھی کر سکیں۔

جب تک خلافت راشدہ کا دور رہا مسلمان ہر اعتبار سے بلند اور برتر تھے پھر جب یہ دور مبارک ختم ہوا اور خلافت کے بجائے مسلمانوں میں بادشاہت اور شخصی حکومت کا رواج ہوا تب بھی حالت یہ تھی کہ مسلمان ملوک و سلاطین ہیں اور دوسرے قسم کے چاہے جتنے نقائص ہوں، خالص اسلامی نقطۂ نظر سے وہ خواہ کتنی ہی کمزوریوں کے حامل ہوں۔ لیکن اس دور میں بھی غیر مسلموں کے لیے وہ رحمت ہی رحمت تھے۔ یہ مسلمان بادشاہ مسلمانوں پر ظلم کر لیتے تھے۔ لیکن غیر مسلموں سے رواداری، ان کی اس طرح فطرت بن چکی تھی، کہ انھیں کبھی نہیں ستاتے تھے۔ حد یہ ہے کہ بعض بڑے ظالم اور سفاک بادشاہ بھی جن کے خونین کارناموں کے ذکر سے تاریخ کے اوراق لال ہو رہے ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں پر مسلمان ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ سختی کرتے تھے، لیکن کیا مجال جو اُن کے دورِ حکومت میں کسی غیر مسلم کو ظلم و ستم کا ہدف بنایا جا سکے۔

عیسائی اور یہودی اس حقیقت کو اچھی طرح جان گئے تھے، اسی لیے وہ اسلامی حکومتوں کے انقلاب سے بالکل متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ان بادشاہوں کے آنے جانے کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ کوئی بھی آنے والا کسی خاندان کی حکومت ہو۔ انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ وہ اسی طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ اور یہ صرف اُن کی خوش عقیدگی نہیں تھی۔ امر واقعہ تھا، جس کی گواہ تاریخ ہے۔ اور تاریخ کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

(۲)

عقدِ ثانی کا مشورہ

عرب حکومت کی توسیع کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں میں عرب نوآبادیاں بھی قائم ہوتی گئیں۔ بہت سے حوصلہ مند عرب دیارِ وطن سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر عرب مملکت کے مختلف علاقوں میں آکر بس گئے۔ اور مختلف مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ ان نوآبادکار عربوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ وہ بھی تھے جو سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور وہ بھی جو کاروبار کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

مرو یوں تو ایران کا ایک حصہ تھا، لیکن یہاں بھی متعدد عرب خاندان آکر بس گئے تھے۔ اُن میں سے ایک خاندان کا سربراہ زید تھا۔ یہ ایک اولوالعزم اور حوصلہ مند عرب تھا۔ مذہبی جوش سے بھرپور، کئی جنگوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اس

کی بہادری شجاعت اور بے باکی کے اُس کے ساتھی دل سے قائل تھے۔

زید نے اگرچہ ایک مقامی خاتون سے شادی کر لی تھی، لیکن اُسے اپنی عربیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ اس اصول کا سختی سے قائل تھا۔ کہ عرب جہاں بھی ہو اُسے اپنی عربیت کا تحفظ ہر حالت میں کرنا چاہیے۔ گفتار، کردار، وضع، معاشرت، نشست و برخاست، چال ڈھال، ہر معاملہ میں اُسے دوسروں سے ممتاز ہونا چاہیے۔ اسے ایسا ہونا چاہیے۔ کہ دوسرے لوگ اُسے دیکھ کر پکار اُٹھیں کہ بس یہ ہے خالص عرب۔

جنگ و جدل اور حرب و پیکار کے معرکوں سے جب زید کا دل بھر گیا تو اُسے شادی کی سوجھی۔ میدانِ جنگ میں اس نے اہلی زندگی کا کبھی خیال تک نہ کیا۔ اور جب عافیت پسندی پر طبیعت راغب ہوئی تو اُس نے تجارت اور کاروبار چھوٹے پیمانہ پر شروع کر کے ایک شریف خاندان کی خوش جمال اور خوش اندام خاتون سے شادی کر لی۔ میاں بیوی کی عمریں کافی تفاوت تھا۔ زید کی عمر ۴۵ سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اور سکینہ نے ابھی زندگی کی صرف ۲۲ بہاریں دیکھی تھیں۔ لیکن دونوں میں از حد محبت تھی۔ جس طرح زید سکینہ پر دل و جان سے فدا تھا، اسی طرح سکینہ بھی سچے دل سے اس سے محبت کرتی تھی۔ شروع میں ان دونوں کی زندگی بڑے سکون و اطمینان سے گزری۔ لیکن شادی کے چھ سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ سکینہ کی عمر بھی ڈھلنے لگی تھی، اور زید تو اب بڑھاپے کی سرحد سے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ دونوں کے دل میں اولاد کی تمنا پروان چڑھ رہی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے جذبات کی رعایت دونوں کو اس درجہ ملحوظ تھی

کہ اولاد کا نام کسی کی زبان تک نہیں آتا تھا۔ سکینہ کی اُمنگیں برقرار تھیں۔ لیکن زید کا دل بجھتا جاتا تھا۔ سکینہ ہر نماز کے بعد خدا سے گڑگڑا کر اولاد کی دعا کیا کرتی تھی اور زید بجھے ہوئے دل کے ساتھ یہ سوچا کرتا تھا کہ عمر ۵۰ سے آگے نکلی جا رہی ہے اب اولاد ہونے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ اور مزید ستم یہ تھا کہ ایک طرف اولاد کا غم دوسری طرف کاروبار تھا کہ جنگل کی آگ کی طرح بڑھ رہا تھا۔ اس نے بہت تھوڑی رقم سے کاروبار کا آغاز کیا تھا، لیکن دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ وہ اسے سکینہ کی برکت سمجھا کرتا تھا۔ خود سکینہ سے تو نہیں لیکن دوست احباب کے مجمع میں وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"سکینہ بڑی مبارک قدم ہے، جب سے اُس نے اِس گھر میں قدم رکھا ہے ہُن برسنے لگا ہے"۔

اور پھر وہ آہ سرد بھر کر کہتا

"لیکن کتنے دکھ کی بات ہے اولاد نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی، لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ غم نے اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کر دیا ہے"۔

ایک دن اسی طرح سکینہ کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دوست نے کہا۔

"بھائی سکینہ کی تعریفیں اتنی کرتے ہو۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اب تک وہ تمھارے بچّے کی ماں نہ بن سکی۔ آخر یہ دولت کس کے کام آئے گی؟ یہ کاروبار کون سنبھالے گا؟ تمھارا نام کس سے روشن ہوگا؟ خاندان کا نام کون چمکائے گا؟ بے اولاد گھر بھی کوئی گھر ہے"؟

زید نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔

"سچ کہتے ہو میرے دوست! مجھے بھی یہ فکر ہے اور سچ کہتا ہوں جب یہ خیال آتا ہے تو اختلاج کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دُکھ کی دوا، اس غم کا مداوا کیا ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"کیوں نہیں ہے؟ — ہے! اور ہاں ——

"تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں"

زید نے حیرت سے اپنے دوست کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ آخر وہ مداوا مجھے کیوں نہیں بتاتے؟"

دوست نے جواب دیا۔

"بتا تو دوں، لیکن تم عمل بھی کرو گے اُس پر؟"

زید نے کہا۔

تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؛ میری اس کے سوا اور تمنا کیا ہے؟"

بڑی بے تکلفی کے ساتھ دوست نے کہا۔

"تو پھر شادی کر لو —!"

زید چونک پڑا۔

"دوسری شادی کر لوں"؟

وہ بولا

"ہاں — تو کون سا غضب آجائے گا"

زید بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو سعید —! اس عمر میں دوسری شادی؟ جانتے ہو میری عمر کیا ہے؟"

سعید:۔"ہاں — پچاس پچپن سال کے ہو گئے"۔

زید:۔"ہاں۔ اسی کے لگ بھگ میری ہے۔ یہ عمر شادی کی نہیں ہوا کرتی میرے دوست

سعید:۔"کیوں نہیں ہوتی؟ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اور پھر ایک عرب، اُسے قدرت نے بڑی فیاضی سے تنومندی عطا فرمائی ہے۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھو۔ عمر سے کم از کم ۱۰ سال کم معلوم ہوتے ہو"۔

زید:۔ہاں یہ تو ہے۔ جب تک میں خود نہ بتاؤں میری عمر کا اندازہ کسی کو نہیں ہو پاتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے"۔

سعید:۔ مایوسی کی باتیں کم از کم تم جیسے باحوصلہ شخص کو زیب نہیں دیتیں۔ یہ عمر بھی کوئی عمر ہے! مرد تو ساٹھا پاٹھا ہوتا ہی ہے —— اگر تم تیار ہو تو میں کوشش کروں۔ ایک خالص عرب خاندان میں۔ خدا کی قسم ایسی خوب صورت اور خوب سیرت لڑکی ہے۔ کہ دیکھ کر عش عش کر اٹھو گے صورت میں لاجواب، سیرت میں انتخاب"

زید۔ (پریشان ہو کر) نہیں بھائی میں اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ تمھاری بات مان سکوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ قطعاً ناممکن ہے۔

سعید:۔ کوئی وجہ معقول بھی بتاؤ اس انکار کی — خالی خولی انکار نہیں چلے گا

——— صاف کہو کیا بات ہے ؟ کیوں نہیں راضی ہوتے تم ؟ میں کیسے مان لوں کہ تم اس پر تیار ہو کہ اپنے خاندان کو بے نام و نشان چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔

زید :۔ میں سکینہ کا دل نہیں توڑ سکتا۔

سعید :۔ دل ٹوٹنے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ! کون مرد ہے جو تعدد ازدواج کا قائل نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ کہ تم سکینہ کی حق تلفی نہ ہونے دینا بس۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے اس کو ؟

زید :۔ نہیں۔ وہ بڑی وفادار اور نیک بیوی ہے۔ عقد ثانی سے اُسے بہر حال صدمہ ہوگا۔ اور میں اس کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔

سعید :۔ چاہے تمہارا نام لیوا کوئی نہ رہے۔

زید :۔ امرِ ربی میں کسی کو کیا دخل ؟ اگر خدا کی مرضی یہی ہے۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

سعید :۔ ارے بھائی سوچو تو، مردوں کو عقد ثانی کی اجازت کیوں دی گئی ہے صرف اسی لیے۔ ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔

زید :۔ لیکن میں اس اجازت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سعید :۔ اچھا میں ایک تدبیر کرتا ہوں۔

زید :۔ کون سی تدبیر ؟

سعید :۔ میں اپنی بیوی حلیمہ کو اس کے پاس بھیجتا ہوں۔ وہ حلیمہ کی سہیلی ہے حلیمہ اُسے سمجھائے گی کہ اس کے مستقبل کا دار و مدار اسی میں ہے۔ کہ وہ تمہیں

دوسری شادی کر لینے دے - حلیمہ بڑی باتونی عورت ہے - دیکھ لینا اپنی باتوں کے
جال میں اُسے ایسا پھنسائے گی کہ اُس کے بینے نکلنا ناممکن ہو جائے گا

زید :- اچھا - تم حلیمہ کو اُس کے پاس بھیجو - لیکن ابھی نہیں -

سعید :- پھر کب ؟ نیک کام میں دیر کیوں ؟

زید :- کل میں کاروباری سفر پہ جا رہا ہوں - شاید دو تین مہینے کے بعد واپسی
ہو گی - جب میں سفر پہ چلا جاؤں تب -

---

(۴)

سعید اور حلیمہ

جس طرح سعید اور زید میں بڑی دوستی تھی، اُسی طرح حلیمہ اور سکینہ میں بھی بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ درد کے شریک ہمدم، ہمراز اور ہمساز۔

جب زید کے پاس سے اُٹھ کر سعید گھر گیا۔ حلیمہ کھانا تیار کر چکی تھی، اُس نے شوہر کو دیکھتے ہی خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کیا۔ ہاتھ دُھلائے اور کھانا لا کر رکھ دیا۔ کھانا رکھ کر وہ واپس جا رہی تھی کہ سعید نے اُسے پکارا۔

"حلیمہ، سُنو تو!"

وہ واپس آ گئی۔

سعید نے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں تم سے"۔

وہ بیٹھ گئی۔

کھانا بڑے مزے کا تھا۔ سعید مزے لے لے کر کھانے لگا۔ حلیمہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ جب اُس نے دیکھا، یہ کھانے میں ہی مگن ہے۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"خواہ مخواہ بلالیا مجھے۔ نہ کوئی بات نہ چیت"۔

سعید مُسکرا دیا۔

"بیٹھ بیٹھ۔ بڑی ضروری بات ہے"

حلیمہ:۔ تو پھر کہتے کیوں نہیں؟

سعید:۔ (مُسکرا کر) سوچا تھا کہ کھانا کھاتا جاؤں گا اور باتیں کرتا جاؤں گا۔ لیکن آج خلاف معمول تم نے اتنا مزے کا کھانا پکایا ہے کہ ساری توجہ اس پر صرف کرنی پڑ رہی ہے۔ کھالوں تو اطمینان سے بات کروں گا ——!

گھر کا کوئی چھوٹا بڑا کام ہو تو جاؤ کر آؤ۔ پھر آ جانا"۔

وہ بولی۔

جی نہیں کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کھانا کھالیں۔ میں بیٹھی ہوں۔ پھر کہیئے جو کچھ کہنا ہے"۔

سعید نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ ہاتھ مُنہ دھو کر اطمینان سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر مسند پر بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا۔

"میرے دوست زید کو بڑا غم ہے بے اولادی کا"۔

ایک ٹھنڈا سانس لے کر حلیمہ نے کہا۔

یہی حال سکینہ کا بھی ہے۔ بیچاری چھپ چھپ کر پہروں روتی ہے نہ جانے کتنی دعائیں کر ڈالیں کتنی منتیں مان ڈالیں، لیکن اولاد نہ آج ہوتی ہے نہ کل۔

سعید: ۔لیکن رونے دھونے اور دعا تعویذ سے تو کام نہیں چلے گا؟

حلیمہ: ۔پھر کس طرح چلے گا؟

سعید: ۔میں نے زید کو مشورہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔

حلیمہ: ۔پھر زید نے کیا کہا؟

سعید: ۔شروع میں تو انکار کرتا رہا۔ لیکن آخر کار اُسے میری بات ماننی پڑی۔ اب وہ آمادہ ہے۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ

حلیمہ: ۔وہ شرط کون سی ہے؟

سعید: ۔یہ کہ سکینہ شوق سے اور خوشی سے عقد ثانی کی اجازت دے دے۔ بغیر اس کے وہ تیار نہیں ہے ——— بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا۔

حلیمہ: ۔مجھے معلوم ہے۔

سعید: ۔تو ہم دونوں کی رائے یہ ہوئی کہ یہ کام تم سے لیا جائے۔

حلیمہ: ۔یعنی میں جا کر سکینہ کو پٹی پڑھاؤں کہ وہ زید کو شادی کر لینے دے۔ ——کیوں؟

سعید: ۔نہیں یہ نہیں ——— اُسے اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ زید کو عقدِ ثانی پر مجبور کر دے۔

PAK. GOVT. GIRLS HIGH SCH.
No. 3926/N. 703
Date 27

حلیمہ :- یعنی وہ اپنے شوہر سے کہے کہ ہیرے اور ایک نوٹ لے آؤ۔ وہ اپنے شوہر سے مطالبہ کرے کہ واسطے خدا کے گہنے آ۔ ... کی بیٹی کا جبر کرنے پر مجبور کرے۔ اور خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارلے۔ وہ خود گلاس میں زہر گھولے اور پی لے۔ وہ خود چاقو لا کے کہیں سے ڈھونڈ کر اور اپنے سینے میں مار لے —— یہی چاہتے ہو نا؟ —— نہیں میں یہ کام نہیں کرسکتی۔ بلکہ اُلٹا زید کے ایسے لتے لوں گی کہ وہ یاد کریں گے۔ ایسی وفادار اور محبت کرنے والی بی بی کے ساتھ یہ سلوک —— اس کا ایثار دیکھو کہ ابھی جوان ہے۔ کم از کم زید کے مقابلہ میں تو جوان ہی ہے۔ لیکن ان بڑے میاں سے شرافت کے ساتھ عہد وفا نباہ رہی ہے۔ اور یہ حضرت ایک طرف تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں دوسری طرف بیاہ رچانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ واقعی مردوں کی ذات بڑی حریص اور خود غرض ہوتی ہے۔ توبہ۔ توبہ!

سعید :- او ہو بھائی، تم نے تو پوری تقریر کر ڈالی۔ ذرا بات تو پورے طور پر سُن لو۔

حلیمہ :- سُن رہی ہوں۔ نہ جانے کون سی نئی بات اب سوجھی ہے آپ کو۔

سعید :- بات یہ ہے کہ اگر زید کی شادی زینب کے ساتھ کر دی جائے تو کیا رائے ہے؟

حلیمہ :- کون زینب؟ جو تین مرتبہ طلاق لے چکی ہے۔ اور چار مرتبہ بیوہ ہو چکی ہے جس کی صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے —— وہی زینب!

سعید :- اُو ہو تم تو پاگل ہو۔ میں نے زید کو باور کرا دیا ہے کہ وہ دوشیزہ ہے۔

حلیمہ :۔ تم سمجھتے ہو تم نے اُسے جو کچھ باور کرایا ہے، اُسے مان لے گا ۔۔۔ ؟
دھوکے کی عمر زیادہ نہیں ہوتی ! ۔۔۔۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو ۔ کہاں سکینہ کہاں
زینب ، کوئی نسبت بھی ہے دونوں میں ؟

سعید :۔ ارے خدا کی بندی پورے طور پر بات تو سمجھ لے ۔ یہ بھی تو یاد کر کہ زینب
کی کئی اولادیں ہو چکی ہیں ۔ پھر کیا زید کے حرم میں آنے کے بعد وہ بانجھ ہو جائے
گی ؟

حلیمہ :۔ لیکن اُسے کیوں بھولے جا رہے ہو کہ اُس کی ایک اولاد بھی زندہ نہیں رہی ۔

سعید :۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے ۔ اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے ۔

حلیمہ :۔ کچھ ہو ۔ میں تو یہ شادی نہیں ہونے دوں گی ۔

سعید :۔ گویا دوسرے الفاظ میں تم انکار کرتی ہو کہ سکینہ سے بات چیت نہیں
کرو گی کیوں ؟

حلیمہ :۔ ہاں یہی سمجھ لو ۔

سعید :۔ کم بخت عورت کیوں اپنے اور میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے ۔ ساری
عمر تو فاقہ اور تنگ دستی میں گزر گئی ۔ اب کیا مطلب ہے کہ اس موقعہ کو بھی
کھو دیں ۔۔۔ کم از کم دو تین ہزار روپیہ تو کہیں نہیں گئے ہیں ۔ اب زید ہماری طرح
غریب نہیں ، بہت بڑا تاجر ہے ۔

حلیمہ :۔ ہوا کرے ، مجھے ایسا روپیہ نہیں چاہیے ۔

سعید :۔ مجھے تو چاہیے ۔

حلیمہ :۔ تو تم خود کیوں نہیں کہتے سکینہ سے جا کر ؟

جانا پڑے گا۔ تجھے

سعید: ۔ میں نہیں جاؤں گا، تجھے جانا پڑے گا۔

حلیمہ: ۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی کسی اور کا معاملہ ہوتا تو چلی بھی جاتی لیکن سکینہ میری سہیلی ہی نہیں محسن بھی ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے کہ اُس نے میرے ذرا سے اشارے سے پچاس درہم قرض دے دیئے۔

سعید: ۔ کہاں پچاس کہاں تین ہزار ۔۔۔ ذرا سوچو تو۔

حلیمہ: ۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میں نہیں جاؤں گی سکینہ کے پاس۔ زینب کی دلالی کرنے ۔۔۔ یہ پیشہ تمہیں کو مبارک۔

سعید: ۔ (بگڑ کر) اگر تو نہیں جائے گی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔

طلاق کا نام سُن کر حلیمہ سہم گئی۔ اُس نے عاجزانہ لب و لہجہ میں کہا۔ "مجھ پر ظلم نہ کرو۔ جو کام میں نہیں کر سکتی اس پر کیوں مجبور کرتے ہو؟"

سعید غصہ میں آ چکا تھا۔ وہ باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ "میں کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ صرف چوبیس گھنٹے کی تجھے مہلت دوں گا۔ کل یا تو سکینہ کے پاس جائے گی، یا اس گھر سے بوریا بستر باندھ کر تجھے ہمیشہ کے لیے نکلنا پڑے گا۔"

حلیمہ رونے لگی اور سعید باہر چلا گیا۔

۴

سکینہ اور حلیمہ

سعید نے حلیمہ کو اتنی بڑی دھمکی دی کہ وہ ایک آہ کر کے رہ گئی۔ اس کے سپرد ایسی ذمہ داری کی گئی تھی جس سے نہ صرف یہ کہ اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا گناہ سمجھتی تھی۔ سکینہ اُس کی محسنہ تھی۔ آڑے وقتوں میں وہ اکثر اس کے کام آیا کرتی تھی۔ روپے پیسے سے بے دریغ مدد کرتی تھی۔ اس کے لیے سوت کا انتخاب اس کے ذمہ تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُسے اس پر آمادہ کرنا تھا کہ خود اپنے شوہر سے اصرار کرے کہ وہ دوسری شادی کر لے ؎

زہر دے اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

یہ ایسی عجیب و غریب کش مکش تھی جس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا لیکن گریم مشکل دگر نہ گویم مشکل، مالا معاملہ تھا۔

پھر مزید ستم یہ کہ اس کے لیے جو سوت تجویز کی جا رہی تھی، وہ صورت اور سیرت کسی اعتبار سے بھی اُس کی ہمسر نہیں تھی۔ بلکہ ہر لحاظ سے اُس کے مقابلہ میں پست اور ہیچ تھی۔ عادات و خصائل کے اعتبار سے تو وہ اتنی رکیک اور ذلیل تھی کہ کسی شریف آدمی کی بیوی بننے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی چہ جائے کہ زید جیسے مردِ معقول کی۔

تھوڑی دیر بعد سعید پھر واپس آیا۔ اس نے اپنی بیوی کو فکر مند اور پریشان و مضطرب دیکھ کر اندازہ لگا لیا۔ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ دل میں حلیمہ خواہ کتنی ہی برہم اور غمگین ہو، لیکن اب وہ سکینہ کے پاس ضرور جائے گی۔ اور اُسے آمادہ کرے گی کہ وہ زید کو بے اولاد ہونے کے باعث دوسری شادی کی رائے دے۔

سعید نے سوچا لوہا گرم ہے۔ اس موقعہ پر ذرا اور اکسا دینا چاہیے۔ اُس نے حلیمہ سے کہا۔

سُنتی ہو جی، میں اب جا رہا ہوں۔ تم میرا انتظار نہ کرنا جو فریضہ میں نے تمہارے سپرد کیا ہے، اُسے انجام دینے کی کوشش کرنا۔ اسی پر مستقبل کا انحصار ہے۔

سعید چلا گیا اور حلیمہ رونے لگی۔

کمزوروں اور بے بسوں کے پاس یہی ایک ہتھیار ہے جسے وہ جب چاہتے ہیں استعمال کرنے لگتے ہیں لیکن سعید اس کے گریہ حسرت سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

ساری رات حلیمہ نے رو رو کر کاٹی

نہ اُس نے ایک لقمہ کھانے کا کھایا، نہ ایک لمحہ کے لیے اُسے نیند آئی۔ ایک نہایت ناخوشگوار فریضہ اُسے بار بار جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ ایسا فریضہ تھا جس سے وہ

جتنا وہ بھاگتی تھی اتنا ہی وہ قریب تر آتا جا رہا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ وہ سیدھی سکینہ کے گھر پہنچی۔ سکینہ اُسے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئی۔ جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی۔ جیسے کوئی بہت بڑی دولت ہاتھ آگئی۔ اس نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا۔

"جاؤ حلیمہ ہم تم سے نہیں بولتے ——"

حلیمہ نے پوچھا۔

"کیوں بہن کیا خطا سرزد ہوئی مجھ سے؟"

سکینہ نے جواب دیا۔

"تم اب بہت دیر دیر میں ملنے لگی ہو۔ ذرا حساب تو کرو آج کتنے دن بعد تم نے اس گھر میں قدم رکھا ہے —— بے مروت بے وفا کہیں کی"

اور یہ کہہ کر وہ پھول کی طرح مسکرانے لگی۔

حلیمہ سکینہ کے اس محبت بھرے طرزِ عمل سے خون کے آنسو رو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کر رہی تھی سکینہ کتنی خوش ہے۔ کتنی مسرور ہے جب میں اسے بتاؤں گی کہ تمہارے خلاف اس طرح کی سازشیں ہو رہی ہیں، یہ منصوبے تیار ہو رہے ہیں، خود ہی اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا لگا لینے کو تیار ہو جاؤ، ورنہ بُری طرح ماری جاؤ گی۔ اس طرح تمہاری جان بھی جائے گی ماہیانِ دریا اور مُرغانِ ہوا کو تم پر رحم آئے گا۔ مگر وہ درندہ جس کا نام مرد ہے، تمہارے تڑپنے، پھڑکنے بیتاب ہونے سے لُطف تو لے گا۔ مگر رحم ذرا بھی نہ کھائے گا۔

وہ سوچ رہی تھی جب میں یہ سب کچھ سکینہ سے کہوں گی تو اُس کا مسکراتا ہوا

بارونق چہرہ پژمردہ اور مضمحل ہو جائے گا۔ اس وقت یہ بلبل کی طرح چہک رہی ہے۔ پھر اسے چپ لگ جائے گی۔ اب اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی ہے پھر انہی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا لگ جائے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اُس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ہزارہا کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر سکینہ بے قرار ہو گئی۔ اُس نے اپنی محبوب سہیلی کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

ارے یہ کیا ہوا حلیمہ؟ تم رونے کیوں لگیں ——— ! میں نے یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ تم اتنی نازک طبع ہو۔ اچھا بھئی غلطی ہوئی معاف کر دو۔"

اور یہ کہتے ہوئے خود سکینہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

حلیمہ نے اُسے گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"بھلا میں تم سے خفا ہو سکتی ہوں۔ تیری کسی بات کا بُرا مان سکتی ہوں۔ ناممکن قطعاً ناممکن"

سکینہ نے پوچھا۔

"پھر رونے کیوں لگیں ——— ؟ بتاؤ !

حلیمہ :۔ کوئی خاص بات نہیں۔ کچھ پُرانی باتیں یاد آ گئیں ——— خیر ہو گا ہاں بتاؤ، بھائی زید کہاں ہیں؟ اس وقت دکھائی نہیں دیتے گھر میں۔

سکینہ بولی۔

"کاروباری ضرورت سے سفر پر گئے ہیں"۔

حلیمہ:۔ کب؟

سکینہ:۔ جانے والے تو آج تھے۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچا رات ہی کو بستر باندھ روانہ ہو گئے۔ میں روکتی بھی رہی۔ لیکن وہ بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔

حلیمہ:۔ کب تک آئیں گے؟

سکینہ:۔ اب سفر پر گئے ہیں تو دو تین مہینے سے کیا کم مدت لگے گی آنے میں۔

حلیمہ:۔ ہو سکتا ہے پہلے ہی واپس آ جائیں۔

سکینہ:۔ ہو تو سب کچھ سکتا ہے۔ لیکن اب تک ایسا ہوا نہیں کبھی —— ماشاء اللہ کاروبار ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایک جگہ جاتے ہیں تو خواہ مخواہ آس پاس کی جگہوں پر اور جانا پڑتا ہے۔

حلیمہ:۔ ہاں یہ تو ہے۔ خدا ان کے کاروبار میں برکت دے۔ دن دونی رات چوگنی ترقی کریں۔ اور ماشاء اللہ ہو بھی ایسا ہی رہا ہے —— لیکن بس ایک بات کا غم ہے ——!

سکینہ:۔ کا ہے کا غم؟ حلیمہ صاف کہو۔

حلیمہ:۔ اسے ہی کہ ماشاء اللہ اتنے بڑے کاروبار کا والی وارث کوئی نہیں سکینہ نے شرارت بھری آنکھوں سے حلیمہ کو دیکھا پھر اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"چپ ——!!"

حلیمہ نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

کیوں ——— ؟ چُپ کیوں کر رہی ہو؟ کیا یہ خیال تمھارے دل میں نہیں آتا؟ ضرور آتا ہوگا۔

سکینہ مسکراتی، پھر اُس نے بڑے انداز سے کہا۔

"آتا تھا ——— لیکن اب نہیں آتا"

حلیمہ:۔ یہ کیوں بھلا؟ یہ تو عجیب بات کہہ دی تم نے ——— کیا کسی کو گود لے لیا ہے۔

سکینہ:۔ نہیں ——— ہم گود لینے کے قائل نہیں۔

حلیمہ:۔ (مسکرا کر) تو کیا کوئی بچہ چپکے چپکے پیدا کر لیا؟

سکینہ:۔ ہاں ——— اسی کا بندوبست کر رہی ہوں۔

حلیمہ:۔ بہت پریشاں نہ کرو۔ بتا دو نا کیا بات ہے؟

سکینہ:۔ پگلی کہیں کی ——— بات کیا ہوتی؟ پیٹ سے ہوں اور کیا۔

حلیمہ اُچھل پڑی۔ اس نے وفورِ مسرت سے سکینہ کو کلیجہ سے لگا لیا اور پُرامید لہجے میں دریافت کیا۔

"سچ ——— ؟"

سکینہ:۔ ہاں۔ خدا کی قسم سچ ——— بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی مجھے! اور وہ بھی تم سے۔

حلیمہ:۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کیسے جانا تم نے؟

سکینہ ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ اس نے کہا۔

"میں نہ جانوں گی تو کون جانے گا۔"

حلیمہ :- پھر ہم سے کیوں نہ کہا - !
سکینہ :- کہتی کیسے ! تم آئیں کب ! اسی کا گلہ تو کر رہی تھی -
حلیمہ :- اچھا یہ بات ہے جناب !
سکینہ :- اور کیا ——— ! کہو کیسی خوش خبری سُنائی تمہیں !
حلیمہ :- بڑی اچھی لیکن ایک بات تو بتاؤ !
سکینہ :- کون سی بات معلوم کرنا چاہتی ہو !
حلیمہ :- بھائی زید کو بھی اس کی خبر ہے !
سکینہ :- بالکل نہیں !
حلیمہ :- ہائے غضب ! یہ کیا ستم کیا تو نے !
سکینہ :- اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے !
حلیمہ :- کیوں نہیں غضب خدا کا -

جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے
باغ تو سارا جانے ہے!

ہمیں تو خبر ہو جائے - مگر لڑکے کے باپ کو پتا بھی نہ ہو -
سکینہ :- تم نہیں جانتیں - ایک مقصد ہے اس کا بھی -
حلیمہ :- ہاں وہ مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا
سکینہ نے بڑے شوخ لہجے میں کہا -
بات یہ ہے کہ تمہارے بھائی زید اولاد کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں - یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھے بھی اولاد کی بڑی تمنا ہے - لہذا اس آرزو کو دل

ہی میں رکھے ہوتے ہیں۔ ظاہر نہیں کرتے۔

حلیمہ:۔ تو اس سے کیا؟

سکینہ:۔ میں نے سوچا ہے اس کی خبر انہیں جب دو دن قریب آجائیں ولادت کے۔

حلیمہ:۔ تاکہ دفعتہً یہ خوش خبری سُنکر وہ تمہارا منہ موتیوں سے بھر دیں۔

سکینہ:۔ ناز سے، ہاں!

حلیمہ:۔ اور اگر میں تم سے پہلے اُس کے کان بھر دوں تو؟

سکینہ:۔ مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کرو گی۔

پھر حلیمہ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"اور بھی کچھ سُنا تم نے؟"

سکینہ بولی

"دن بھر نہ جانے کیا کیا سنتی رہتی ہوں۔ کچھ اتا پتا بھی تو بتاؤ۔"

حلیمہ:۔ بعض خود غرض کوشش کر رہے ہیں کہ بھائی زید کی دوسری شادی کرا دیں ——

بے پرواہی کے ساتھ سکینہ نے کہا۔

"ہاں جانتی ہوں مجھے سب معلوم ہے"

حلیمہ کو یہ سُن کر اچنبھا ہوا۔ اس نے کہا۔

"کیا معلوم ہے؟"

سکینہ:۔ یہی کہ بعض لوگ اس کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ ان کا عقد ثانی کرا دیں۔

حلیمہ:۔ اچھا کون لوگ ہیں وہ؟

سکینہ:۔ ایک تو بھائی سعید ہیں۔ تمہارے شوہر۔

یہ سُنکر حلیمہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے بدقت اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا۔

"نہیں وہ ایسے آدمی نہیں ہیں ——

یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی"

سکینہ:۔ یہ خبر کسی اور نے نہیں خود انھوں نے مجھ تک پہنچائی ہے۔

حلیمہ:۔ (حیرت سے) کس نے؟ بھائی زید نے؟

سکینہ:۔ ہاں۔ جب سفر پہ جانے لگے تو میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "سعید مجھے بھڑکا رہا ہے کہ میں دوسری شادی کر لوں، تاکہ اولاد پیدا ہو۔ میں نے اُس سے تو ہاں کہہ دیا۔ لیکن مجھے ایسی اولاد نہیں چاہیے جو سکینہ کے لیے کلفت کی موجب ہو"

پھر جاتے وقت تاکید سے کہا۔ اگر سعید کی طرف سے اس قسم کی باتیں تم تک پہنچیں تو ذرا بھی پرواہ نہ کرنا۔ باتوں میں اُڑا دینا۔

یہ کہا اور مجھے الوداع کہہ کر چلے گئے"

حلیمہ یہ باتیں سُن رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ یہ بڑے میاں بھی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک طرف خود ہی دوسری شادی پہ تیار ہوتے ہیں دوسری جانب خود ہی جا کے بیوی کو لگا دیتے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ ہنسنے لگی۔

سکینہ نے پوچھا۔

کیوں ہنس رہی ہو!

وہ بولی۔

"یوں ہی ـــــ ہاں یہ تو بتاؤ جب بھائی زید تم سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں تو تم نے پھر جاتے وقت یہ خوش خبری کیوں نہیں سنائی ـــــ ظالم کہیں کی ـــ!

سکینہ نے کہا۔

"کہہ تو چکی ہوں۔ یہ خوش خبری اُنھیں وقت سے پہلے نہیں سُنانا چاہتی"۔

حلیمہ :۔ ٹھیک ہے بھائی، جو مناسب سمجھو کرو ـــــ لیکن آج گھر جاکر ان کی ایسی خبر لوں گی کہ عمر بھر یاد کریں گے ـــــ غضب خدا کا۔

سکینہ :۔ نہیں حلیمہ بہن بھائی سعید سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کچھ نہ کہنا۔

حلیمہ :۔ آخر کیوں؟

سکینہ :۔ جب اُنھوں نے کوئی سلسلہ جذباتی نہیں کی تو پھر خواہ مخواہ شرمندہ کرنے سے کیا حاصل ـــــ؟ وعدہ کرو ان سے کچھ نہ کہو گی؟

حلیمہ :۔ اچھا وعدہ کرتی ہوں۔ لیکن اشارے کنائے میں انھیں یہ تو بتا دوں کہ ان سازشوں کی تمھیں اطلاع ہے۔

سکینہ :۔ نہیں اس کی بھی ضرورت نہیں۔

حلیمہ :۔ اے ہے جیسے میں تمھاری باندی ہی ہوں۔ تم ہم میاں بیوی کے بیچ میں آنے والی کون۔

سکینہ ہنسنے لگی، اُس نے کہا۔

"اچھا بھئی تم جانو اور تمھارے شوہر سعید ہم نہیں بولتے بیچ میں"

حلیمہ:۔ شکریہ ——— اب بتاؤ، دعوت کب کر رہی ہو ہماری؟

سکینہ:۔ جب چاہو۔

حلیمہ:۔ اچھا تم سے تو جب چاہیں گے دعوت لے لیں گے ——— بھائی زید کو آنے دو۔

---

(۵)

شرمندگی

سعید بے تابی سے حلیمہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف تکتا تھا کہ حلیمہ تو نہیں آ رہی ہے۔ لیکن حلیمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔

بڑی دیر کے بعد حلیمہ آئی۔ وہ یہاں سے روتی ہوئی گئی تھی، لیکن مسکراتی ہوئی آئی۔

اُسے دیکھتے ہی سعید نے کہا۔

"کہو کیا کر آئیں — ؟ کیا ہوا ؟"

حلیمہ:۔ تم تو جیسے ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ذرا سانس تو لینے دو۔

سعید:۔ سانس لیتی رہنا اطمینان سے۔ پہلے یہ تو بتا دو ہوا کیا ؟

حلیمہ:۔ کچھ بھی نہیں۔

سعید:- یعنی وہ راضی نہیں ہوتی؟

حلیمہ:- نہیں - اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی اُسے آمادہ نہیں کر سکتا۔

سعید:- تو زبردستی اسے راضی ہونا پڑے گا۔

حلیمہ:- زبردستی کی بات اور ہے۔

سعید:- آخر تم نے کیا کہا تھا اُس سے؟

حلیمہ:- وہی جو تم نے اُس سے کہلایا تھا۔

سعید:- پھر وہ کیا بولی؟

حلیمہ:- وہی جو ابھی بتا چکی ہوں۔

سعید:- حلیمہ تم مذاق کر رہی ہو۔

حلیمہ:- مذاق آپ نے کیا تھا مجھ سے۔ وہ تو کہئے اگر وہ سہیلی نہ ہوتی تو میں
منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔

سعید:- کیوں کیا ہوا؟

حلیمہ:- بھائی زید نے ایک ایک بات سکینہ سے لگا دی جا کر۔

سعید:- یعنی ——؟

حلیمہ:- یعنی یہ کہ اُنھوں نے سفر پہ جاتے وقت اُس کی پیشانی چومی، اور بھرائی
ہوئی آواز میں کہا "سکینہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں بھائی سعید کو شک
کر رہے ہیں کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ ان سے تو میں نے کچھ نہیں کہا
لیکن اگر وہ تم سے کسی قسم کی سلسلہ جنبانی کریں تو اس بات کو مذاق سے
زیادہ نہ سمجھنا۔

سعید:۔ (غصّہ اور برہمی کے عالم میں) واقعی !

حلیمہ:۔ اللہ جانتا ہے۔ مجھ سے سکینہ نے یہی کہا۔

سعید:۔ لاحول ولا قوۃ۔ عجیب غیر ذمہ دار قسم کے آدمی ہیں۔ خود تو اچھے رہے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

حلیمہ:۔ اسی لیے تو کہتی ہوں پرائے بیچ میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔

سعید:۔ ہاں۔ یعنی بڑی غلطی ہوئی۔ اب کبھی ایسے لوگوں کے معاملات میں دخل نہیں دوں گا۔

حلیمہ:۔ خدا کرے جو کچھ کہتے ہو اس پر عمل کرو۔

سعید:۔ دیکھ لینا ــــ اور بھائی زیدکو آ لینے دو، دیکھنا کیسی لڑائی لڑتا ہوں۔

حلیمہ:۔ یہ اور غلطی کرو گے

سعید:۔ یہ کیوں !

حلیمہ:۔ جس طرح انھوں نے بات کو مذاق بنا دیا، تم بھی مذاق میں اڑا دو، اس قدر سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔؟

(۶)

عجیب واقعہ

خلاف اُمید زید کو سفر میں کئی مہینے لگ گئے۔ وہ بار بار وطن واپس آنے کا ارادہ کرتا تھا۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسا سانحہ پیش آجاتا تھا۔ کہ بجائے واپسی کا پروگرام بنانے کے کسی اور طرف کا رخت سفر باندھ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اُس کا دل سکینہ میں لگا ہوا تھا۔ بہت پریشان تھا۔ نہ جانے اس کی طبیعت کیسی ہے؟ خدا معلوم سعید نے اس سے کیا بات چیت کی؟ حلیمہ نے کس کس طرح اسے راضی کرنے کی کوشش کی۔

پھر وہ دل ہی دل میں اپنے آپ پر ملامت کرنے لگتا۔

مجھے بھی کیا سوجھی تھی کہ سعید کی احمقانہ باتوں میں آگیا۔ بھلا یہ عمر شادی کرنے کی ہے۔ یا ٹھیک ہے، میں بے اولاد ہوں، اولاد کی مجھے تمنا ہے۔ بغیر اولاد کے

نہ زندگی میں مزا ہے، نہ کاروبار میں۔ آج مر جاؤں تو کل کوئی فاتحہ دلانے والا بھی نہیں۔ کاروبار ہے کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حتی الامکان بیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یوماً فیوماً ترقی اور عروج پر ہے۔ کوئی اولاد ہوتی تو میری محنت کے اس پودے کا پھل کھاتی۔ کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔ طبیعت خوش ہوتی۔ سکون ملتا۔ راحت میسر آتی ——— لیکن یہ تو تصویر کا ایک ہی رُخ ہے۔

یہ بھی تو ہو سکتا تھا اولاد ہوتی'' ، مر جاتی۔

بہت سے ایسے دوستوں سے واقف ہوں جنھوں نے خوب خوب اولادیں پیدا کیں۔ اور زندگی بھر کم عمر اور جوان اولاد کا داغِ مرگ اُٹھاتے رہے۔ اور اسی غم میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کیا یہی بات میرے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی ——— خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس مصیبت سے اُس نے بچا لیا۔

پھر ایک بات اور بھی تو ہے۔

یہ بھی تو ہوتا ہے کہ بڑی منّت اور آرزو کے بعد اولاد ہوتی ہے، بڑے چاؤ سے اس کی تربیت شروع ہوتی ہے۔ بڑی بڑی اُمیدیں اُس کی ذات سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ لیکن سنِ شعور کو پہنچ کر وہ نالائق ثابت ہوتی ہے ——— صاحبزادے باپ کی کمائی ہوئی دولت سے جُوا کھیلتے ہیں۔ عیّاشی کرتے ہیں ——— فضول خرچی کرتے ہیں اور آخر گھر پھونک تماشہ دیکھنے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جاتے ہیں۔ خود بھی بدنام ہوتے، والدین کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ خاندان کے نام پر بھی کلنک کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔

اگر ایسا میرے ساتھ ہوتا؟

اگر میری اولاد بھی نالائق ہو جاتی تو میں کیا کر لیتا۔ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ اولاد کی نالائقی سے دل کو صدمہ پہنچتا اور دوستوں کے طعنہ ہائے دل خراش الگ سہنا پڑتے۔ اب تو صرف ایک ہی بات ہے۔ کہ بھئی کوئی اولاد نہیں۔ لوگ ترس کھاتے ہیں۔ ہمدردی کرتے ہیں۔ پھر ترس کے بجائے لوگوں کو عبرت ہوتی، سبق حاصل کرتے۔ کہتے، خدا ایسی اولاد سے بچائے جیسی زید کی اولاد ہے۔ میں کیوں نہ خدا کا شکر ادا کروں کہ اُس نے اس فکر و غم سے بھی اولاد نہ دے کر نجات دی

یہ سوال ضرور اہم ہے کہ اس جائداد اور املاک کا کیا ہوگا جو میں نے پیدا کی ہے۔ جو پیدا کر رہا ہوں، اور جس کے پیدا کرنے کا سلسلہ شاید زندگی کی آخری سانس تک جاری رہے گا۔

لیکن اس سے بڑھ کر شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جو کچھ کرے وہ صرف اولاد ہی کے لیے ہو۔ کیا اولاد کے علاوہ دوسرے مستحقین نہیں ہیں جن کی اس مال و دولت سے خدمت کی جائے۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ہاں ٹھیک ہے، میں خدا کے بندوں سے پیار کروں گا۔ اس دولت کا مصرف میں نے تلاش کر لیا۔ اس دولت سے غریبوں، اپاہجوں، یتیموں، بیواؤں اور تباہ حال لوگوں کی مدد کروں گا۔ یہ بہترین مصرف ہے۔ اس سے اچھا مصرف کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

اب میرا دل مطمئن ہے ۔ میں نے منزل پالی ۔ مقصد پالیا ۔

ہاں سکینہ کا خیال ضرور آتا ہے ۔ حلیمہ کی باتیں سن کر اُسے ضرور صدمہ ہوا ہوگا اور سعید حلیمہ کو اس کے پاس بھیجے بغیر نہ رہا ہوگا ۔ لیکن چلتے وقت میں سکینہ کو اچھی طرح سمجھا آیا تھا ، وہ حلیمہ کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی ہوگی ۔

زید یہی باتیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اُس کا ایک گماشتہ ابراہیم آیا ۔ اُسے بحرِ خیال میں غوطہ زن دیکھ کر ایک کونے میں خاموش بیٹھ گیا ۔ زید کی جب اُس پر نظر پڑی تو اُس سے پوچھا ۔

" کہو بھئی ابراہیم کیسے آ گئے ؟ "

ابراہیم نے کہا

" آیئے حساب کتاب کر لیں ۔ بہت دن ہو گئے یونہی بغیر کسی تصفیہ کے پڑا ہے ۔ "

زید :- میں نے رات حساب کیا تھا ۔ تمہارے ذمہ بارہ ہزار درہم نکلتے ہیں ۔ پوچھ گچھ کرنی ہو تو میرے وکیل صالح بن محمد سے دریافت کر لو ۔

ابراہیم :- آپ پر مجھے کامل اعتماد ہے ۔ یہ ہنڈی میں آپ کو لکھے دیتا ہوں لے لیجئے ۔

یہ کہہ کر ابراہیم نے ہنڈی زید کی طرف بڑھا دی ۔

زید نے ہنڈی قبضہ میں کر لی ۔ پھر اُس نے کہا ۔

" ہمارا تمہارا حساب صاف ہو گیا ہے ۔ "

ابراہیم :- جی ہاں صاف ہو گیا ۔ مجھے یاد ہے صالح بن محمد نے بھی یہی رقم مجھے

بتانی تھی۔

زید:۔ تمھاری والدہ تو زندہ ہوں گی۔

ابراہیم:۔ ہاں ـــــ زندہ بصورت مردہ

زندہ:۔ یہ کیوں؟

ابراہیم:۔ جب سے والد کا انتقال ہوا ہے اُنھوں نے دنیا کی ہر لذت اپنے اُوپر حرام کر لی ہے۔ یہ غم اندر ہی اندر اُنہیں کھائے جا رہا ہے۔ مجھے تو اب ان کی طرف سے مایوسی ہوتی جا رہی ہے۔

زید:۔ (ایک ٹھنڈی سانس لے کر) ہاں جانتا ہوں۔ ان میاں بیوی میں اتنی محبت تھی ـــــ تم نے کبھی اپنی ماں سے ایک بات بھی پوچھی؟

ابراہیم:۔ کون سی بات چچا جان؟

زید:۔ یہ کہ تمھارے والد کچھ اندوختہ بھی چھوڑ گئے یا نہیں؟

ابراہیم:۔ پوچھا تھا مگر وہ کچھ نہیں بتائیں۔ اُنھیں کچھ نہیں معلوم۔ صرف ایک بات کہتی ہیں، اُن کے پاس پچاس ساٹھ ہزار درہم تھے۔ جو اُنھوں نے کسی دوست کے پاس رکھائے تھے۔

زید:۔ کون دوست تھا وہ؟

ابراہیم:۔ یہی تو نہیں معلوم،

زید:۔ پتہ چلایا ہوتا۔

ابراہیم:۔ چچا جان! والد مرحوم کا حلقۂ احباب اتنا وسیع تھا کہ ہر کسی سے پوچھنا ممکن نہیں۔ اور اگر پوچھوں بھی تو اتنی بڑی رقم کا پتہ کون بتائے گا۔

زید :- لیکن تمھارے والد جب تمھاری والدہ کو اس قدر زیادہ مانتے اور چاہتے تھے، انھیں تو اس راز سے کم از کم باخبر کر دینا چاہیے تھا ——! حیرت ہے اپنی محبوب ترین بیوی تک کو نہیں بتایا۔

ابراہیم :- یہی سوال میں نے بھی اماں جان سے کیا تھا۔

زید :- (اشتیاق کے ساتھ) پھر اُنھوں نے کیا جواب دیا —؟

ابراہیم :- وہ کہنے لگیں. تمھارے باپ نے مجھ سے کبھی کوئی راز نہیں چھپایا سوا اس راز کے، میں پوچھتی وہ ٹال جاتے۔ ایک دفعہ میں نے بگڑ کر دریافت کیا اگر تم نے نہ بتایا کہ روپیہ کہاں ہے تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گی —— —

زید :- اچھا —— پھر کیا کہا تمھارے والد نے؟

ابراہیم :- والد نے جواب دیا۔ اُس شدید محبت کے باوجود جو مجھ تم سے ہے، میں تمھاری خفگی برداشت کر لوں گا۔ مگر یہ راز نہیں بتاؤں گا۔

زید :- آخر راز نہ بتانے کا کوئی سبب تو بتایا ہوگا؟

ابراہیم :- جی ہاں —— بتایا تھا۔

زید :- وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ابراہیم :- والد نے کہا یہ رقم میں نے ایک بہت متقی اور ایماندار دوست کو قرض دی ہے. نام بتا کر اپنے بعد اُسے رُسوا کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اس کی ایمانداری پر بھروسہ ہے۔ جب دے سکے گا ضرور دے دے گا۔ لیکن اگر مجبوری سے نہ دے سکا تو میں نہیں چاہتا میرے بعد میرے ورثا تقاضہ کر کے اُسے پریشان کریں

یہ سُن کر والدہ چُپ ہو گئیں۔ پھر اُنھوں نے بھی نہ پوچھا یہاں تک کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔

زید بڑے غور سے ابراہیم کی باتیں سُن رہا تھا۔ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابراہیم ——! جاننا چاہتے ہو تمھارے باپ کا وہ ایماندار، مخلص اور محبوب دوست کون ہے؟

ابراہیم :۔ نہیں چچا جان ——! میں نہیں معلوم کرنا چاہتا۔

زید :۔ (حیرت سے) ارے یہ کیوں ——؟ میں جانتا ہوں اُس شخص کو

ابراہیم :۔ اگر آپ جانتے ہیں تو اس راز کو اپنے ہی تک رکھئے۔

زید :۔ (اور حیرت سے) یا اللہ ——! اے لڑکے کیوں؟

ابراہیم :۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے والد کا دوست رُسوا ہو۔ ممکن ہے آپ کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہو۔ لیکن جس بات کو والد نے ہمیں نہیں بتانا چاہا اُسے ہم معلوم کرنا نہیں چاہتے۔

زید :۔ میں اُس شخص سے ساری رقم تمھیں دلا سکتا ہوں

ابراہیم :۔ چچا جان! آپ کی اس شفقت اور نوازش کا بہت بہت شکریہ لیکن وہ روپیہ بھی مجھے نہیں چاہیے۔

زید :۔ میں دیکھ رہا ہوں، ایماندار تاجر ہونے کے باوجود آج کل تم کاروباری اُلجھنوں اور پریشانیوں میں گرفتار ہو؛ سوچو تو پچاس ساٹھ ہزار درہم اس وقت تمھارے کام آئیں گے —— اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی

کیوں مار رہے ہو میاں صاحبزادے۔؟

ابراہیم :۔ وجہ اور سبب ابھی عرض کر چکا۔ رہیں پریشانیاں تو وہ زندگی کے ساتھ ہیں۔ میں ان سے ہراساں نہیں ہوتا۔ دال روٹی مل ہی جاتی ہے۔

زید :۔ پھر سوچ لو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں، ورنہ یاد رکھو اگر میں چلا گیا تو اس مقروض کا نہ کبھی پتہ چل سکے گا۔ نہ روپیہ مل سکے گا۔ کیوں کہ میں روز روز تو یہاں آتا نہیں۔

ابراہیم :۔ چچا جان! میرا وہی جواب ہے جو ابھی عرض کر چکا ہوں — مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ پتہ، نہ روپیہ۔ مجھے اپنے والد کے کہے پر بھروسہ ہے۔

زید :۔ کس قسم کا بھروسہ؟

ابراہیم :۔ یہ کہ وہ دوست ایماندار ہے۔ اگر اُس کے پاس روپیہ ہوگا تو وہ خود دے دے گا اور اگر مجبور ہوا تو نہیں دے سکے گا۔ دے سکتا ہوتا تو دے چکا ہوتا۔ نہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مجبور ہے اور کسی کو مجبوری کے عالم میں ستانا میں پسند نہیں کرتا۔

زید :۔ اچھا بھئی تم جانو ——— ہم جس خدمت کے لائق تھے اس کے لیے تیار تھے۔

ابراہیم :۔ شکریہ

پھر وہ جانے کے لیے اُٹھا۔ زید نے اُسے جاتا دیکھ کر پوچھا۔

"کیا جا رہے ہو تم؟"

ابراہیم :۔ جی ابھی بہت سے کام انجام دینا ہیں"

زید:- کل صبح میں جا رہا ہوں۔ اس دفعہ بہت دنوں کے بعد آنا ہوا۔ اور تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ آج پہلی بار ملے ہو۔

ابراہیم:- واقعی بڑا شرمندہ ہوں، حاضر نہ ہو سکا۔ لیکن کچھ ایسی ہی الجھنوں میں گرفتار رہا۔

زید:- کس قسم کی الجھنیں ——— ! یعنی ہم کوئی غیر نہیں۔ تمہارے والد ہمارے بھی تو دوست تھے۔

ابراہیم:- بے شک ——— صالح بن محمد کا اصرار تھا کہ رقم آپ کی موجودگی ہی میں ادا کر دی جائے۔ میرے پاس پوری رقم تیار نہیں تھی۔ مجبوراً قرض کا بندوبست کرنا پڑا۔ اسی دوا دوش کے باعث حاضر نہ ہو سکا۔

زید:- (خفگی کے لہجے) تم نے مجھ سے کیوں نہیں ذکر کیا۔

ابراہیم:- رقم تو بہر حال دینی ہی تھی۔ یا چند دن پہلے یا چند دن بعد۔ پھر اصل سابقہ تو صالح بن محمد سے رہتا ہے۔ آپ تو چلے جاتے وہ بعد میں بُرا مانتے کہ اُن کی بات ماننے کے بجائے میں نے آپ سے اس کی شکایت کر دی۔

زید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اچھا اس وقت تم بھی کام پر جا رہے ہو۔ اور مجھے بھی ایک ضرورت سے باہر جانا ہے۔ ایسا کرو۔ آج رات کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

ابراہیم:- بہت بہتر!

دونوں اپنے اپنے راستے چلے گئے۔

عشا کے بعد ابراہیم زید کے ہاں پہنچ گیا۔ دونوں نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ پھر زید اُٹھا۔ اور تہہ خانے سے کئی بڑی بڑی تھیلیاں، دیناروں کی بھر کر لایا۔ تھیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"بیٹے ——— یہ تمھارے روپے ہیں ——— تمھارے باپ کا وہ مخلص محبوب اور ایماندار دوست میں ہوں"

یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ اُس نے ابراہیم کو کلیجہ سے لگایا اور کہا۔

واقعی تو اپنے باپ کا سچّا بیٹا ہے۔ تیرے حوصلے کا میں نے امتحان لیا اور پُورا اُترا۔ اور دیکھ تو مجھے چچا کہہ چکا ہے ——— لے یہ اپنی ہنڈی۔ یہ میری طرف سے ایک حقیر تحفہ ہے۔

(۷)

انعام

کئی مہینے کی سیاحت اور تجارتی دورہ کے بعد جب زید گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر وہ سن سے ہو گیا کہ سارے گھر میں ایک عجیب قسم کی پُراسرار سی کیفیت پریشان کن سرگرمی کا دور دورہ ہے۔ لوگ اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ اس نے دیکھا ایک طبیب گھر سے نکل رہا ہے۔ طبیب کو دیکھ کر زید کو یقین ہو گیا، ضرور کوئی حادثہ ہے۔ اور کسی کی خبر نہیں۔ یہی سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ اس نے طبیب سے ہاتھ ملایا اور بولا

"کہیئے کیا حال ہے اندر مریضہ کا؟"

طبیب زید کو بھی جانتا تھا۔ اُس نے کہا۔

"سجدۂ شکر بجا لایئے کہ زچہ اور بچہ دونوں بخریت ہیں۔ میں تو سچ کہتا ہوں

آپ کی بلیہ محترمہ کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن خوبی قسمت کہ دائی اچھی مل گئی اور اس نے بگڑے ہوئے کیس کو سنبھال لیا۔ مریضہ کے دانت بیٹھ گئے۔ بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ نبضیں ساقط ہو رہی تھیں۔ ہر آن دم نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ وہ گھڑی ٹل گئی۔ دونوں اچھے ہیں۔ اور بچہ تو ماشاء اللہ آتا خوبصورت اور تندرست ہے کہ ایک گھنٹہ کے بجائے ایک ہفتہ کا معلوم ہو رہا ہے۔

یکہ کر طبیب صاحب ہنسے۔ زید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ حیرت سے اُن کا منہ دیکھتا رہا۔

پھر طبیب نے کہا۔

"اچھا۔ اس وقت تو میں جاتا ہوں۔ آپ بھی اتنے دنوں کے بعد سفر سے آئے ہیں ذرا ماندگی رفع کر لیجئے۔ پھر میں آپ سے منہ مانگا انعام لوں گا۔"

زید نے نہ اقرار کیا نہ انکار۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ طبیب کیا کہہ رہا ہے۔ چھ مہینے میں سفر پر رہا۔ جب سفر پر گیا تھا۔ بچہ کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ یہ ناخواندہ مہمان کہاں سے ٹپک پڑا۔

یہی سوچتا ہوا وہ گھر میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر گھر کے لوگ چھپٹ گئے۔ وہ سیدھا سکینہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ ایک بستر پر خاموش نیم مہمل لیٹی ہوئی تھی زید کو دیکھ کر مسکرائی اور نظریں نیچی کر لیں۔ اس کے چہرے پر شباب کی رعنائی نہیں تھی۔ مادریت کا وقار تھا۔ زید بے تابی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا اور اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"سکینہ! یہ میں کیا سُن رہا ہوں!"

وہ بولی۔

"شنیدہ کے بود مانند دیدہ —— سُنی سنائی باتوں پر اعتبار نہ کیجئے دیکھ لیجئے اپنی آنکھوں سے"

پھر اُس نے روئی کے گالوں میں لپٹے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ زید بیتابانہ اُس کی طرف بڑھا۔ اور بے ساختہ گود میں لے لیا۔ واقعی بچہ بڑا خوب صورت اور تندرست تھا۔

سکینہ نے پوچھا

کیسا ہے؟

زید نے خوشی کے نشے سے سرشار ہوتے ہوئے کہا

"بڑا پیارا بہت خوب صورت"

سکینہ نے کہا۔

طبیب صاحب کہہ رہے تھے باپ پر پڑا ہے بالکل

زید:۔ مجھے تو اس کے چہرے بشرے ہر چیز میں تمہارا وجود نظر آ رہا ہے۔

سکینہ مُسکرا کر خاموش ہو گئی۔

پھر زید نے پوچھا۔

"لیکن یہ چور روپے پاؤں کیسے آگیا؟"

وہ بولی۔

"اسی سے پوچھئے۔ دیکھئے مسکرا کر آپ کو چڑا رہا ہے۔ بڑا شوخ اور شریر معلوم ہوتا ہے"

زید:۔ لیکن چور یہ تو نہیں تم ہو —— تم نے چھپایا۔ جاتے وقت بھی مجھے نہیں بتایا۔

سکینہ :- سچ کہیے، اچانک اس خبر سے آپ کو زیادہ خوشی ہوئی۔ یا اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو زیادہ ہوتی؟

زید :- خوشی تو اب زیادہ ہوئی ——— اور واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کی یہ الیسی فی الحال حسرت ہے کہ اگر میں ہوش میں نہ رہوں تو بجا ہے۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں۔

خدا نے اس گھر کا نام روشن کرنے والا ایک بچہ ہمیں بخش دیا۔ خدا اسے زندہ رکھے پروان چڑھائے۔ عمر طویل اور عمل صالح کی نعمت سے مالا مال کرے۔

سکینہ :- آمین

پھر زید باہر آیا اور اُس نے تھیلیوں کا مُنہ کھول دیا۔ ملازموں کو خادماؤں کو فقیروں اور محتاجوں کو اُن کی توقع سے زیادہ دیا۔ سعید کو اتنا انعام دیا کہ اگر وہ دوسری شادی کرانے میں کامیاب ہوتا تو بھی اتنا انعام نہ پاتا۔ زید نے سعید کو زرِ نقد بھی دیا اور اپنے کاروبار کا مینجر بنا دیا۔ دوسرے دن طبیب صاحب بھی دائی کو لے کر انعام لینے پہنچے اُنھیں بھی اُس نے مالا مال کر دیا۔

شام کو پھر بیوی کے کمرے میں پہنچا۔ بچّہ اس وقت بے خبری کے عالم میں گہری نیند سو رہا تھا۔ زید نے کہا۔

"سکینہ کل سے اس فکر میں ہوں کہ بچّہ کا نام کیا رکھوں؟ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— کوئی اچھا سا نام ———!"

سکینہ :- دماغ پر زور دیجئے۔

زید :- اے ——— اب تم ہی کچھ مدد کرو۔

سکینہ:۔ سچ پوچھئے تو میں بھی کل سے اسی فکر میں ہوں۔

زید:۔ پھر کچھ سمجھ میں آیا؟ کوئی نام سوچا؟

سکینہ:۔ سوچا تو ہے۔ بشرطیکہ آپ کو پسند آجائے۔

زید:۔ بتاؤ۔ بتاؤ۔ ضرور پسند آئے گا۔ تمہارے حسنِ انتخاب کا ہمیشہ سے قائل ہوں ـــــ ہاں۔ کیا نام سوچا تم نے؟

سکینہ:۔ بچے کی صورت میں خدا نے ہمیں بہت بڑا انعام دیا ہے۔

زید:۔ بے شک۔

سکینہ:۔ بس تو پھر اس سے بڑھ کر اور کیا نام ہو سکتا ہے؟

زید:۔ یعنی انعام؟ ـــــ ہاں بھئی خوب سوچا ـــــ بہت اچھا نام ہے کیوں بے انعام کب تک سوتے گا، اُٹھ۔

زید نے والہانہ خوشی سے بچہ کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ جاگ پڑا، اور رونے لگا۔ سکینہ نے کہا۔

آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ مارے خوشی کے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں اچھے بھلے سوتے ہوئے بچے کو جگا دیا۔ واہ!

زید:۔ تم کیا جانو میرے دل میں خوشی کا کیسا طوفان اُٹھ رہا ہے کاش تم باپ ہوتیں۔

سکینہ ہنس پڑی

"ہٹئے بھی ـــــ!"

(۸)

نقصان

ابراہیم زید کا اب وا احترام پہلے بھی کرتا تھا۔ اب عقیدت کا اظہار بھی کرنے لگا۔ اُس کی ایمانداری اور اخلاص سے وہ بہت متاثر تھا۔ ماں سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد اُس نے طے کیا کہ اب چونکہ دولت کافی ہے۔ حالات سازگار ہیں۔ اور ایک چھوٹے سے مقام پر کاروبار کرنے کے بجائے مرو میں کاروبار شروع کیا جائے۔ اس نقل مکان سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو زید کی سرپرستی اور ہدایت۔ دوسرے ایک متمدن اور ترقی پذیر شہر میں کاروبار کا فروغ چنانچہ زید کے مرو پہنچنے کے چند ہی روز بعد وہ بھی پہنچ گیا۔ زید نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ کئی روز تک اُسے اس کی بیوی اور ماں کو اپنا مہمان رکھا اور بڑے ٹھاٹھ سے ان لوگوں کی دعوتیں کیں۔ چند روز بعد ابراہیم نے شہر کے ایک پُر فضا مقام پر دکان اور مکان

کا انتظام کرلیا اور وہیں خود بھی منتقل ہوگیا

دن جب پلٹتے ہیں تو مٹی بھی سونا بن جاتی ہے ۔ وہی ابراہیم جو وطن میں کاروباری الجھنوں اور دشواریوں میں گرفتار تھا ۔ مردہیں آکر بہت بلند مرتبہ پر پہنچ گیا ۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا ، کامیاب ہوا ۔ جس تجارت کو اختیار کیا توقع سے کہیں زیادہ نفع کمایا ۔ اُس نے زید کو چچا کہا تھا ۔ اور سچّے دل سے اُس کا احترام کرتا تھا ۔ لیکن مردہیں اس کی کاروباری ترقی نے زید کا دل اس سے مکدّر کر دیا تھا ۔ وقتاً فوقتاً سعید اور زیادہ بھڑکایا کرتا تھا زید کو ۔ ایک مرتبہ زید اپنے باغیچے میں فجر کی نماز پڑھ کر ٹہل رہا تھا ۔ کہ سعید آگیا ۔ سعید پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر اُس نے ابراہیم کا ذکر چھیڑ دیا ۔ کہنے لگا ۔

" سُنا ہے آج کل حضرت ابراہیم بڑے اُونچے جا رہے ہیں "

" کیوں ! کیا ہوا ؟ " زید نے دریافت کیا ۔

سعید :۔ ذرا دیکھئے تو بازی بازی بارش بابا ہم بازی " اب ابراہیم نے ہمارے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے ۔ صرف آپ کا خیال ہے ورنہ صاحبزادے کو ایسا شکنجے میں کسوں گا کہ بھاگتے ہی بن پڑے گی ۔ زید باتیں بھی کر رہا تھا اور شغل کے طور پر تسبیح بھی گھما رہا تھا ۔ اس نے تسبیح گردانی روک دی اور ایک دم چونک پڑا ۔

آخر کیا بات ہوئی ؟ کچھ بتاؤ گے بھی "

سعید :۔ بات یہ ہے کہ ہمیشہ سے ہم سرکاری باغوں کا ٹھیکہ لیتے چلے آئے ہیں اگر پوچھئے تو آپ کے کاروبار کا فروغ وعروج اسی ٹھیکے ہی کا رہین منت ہے

زید:۔ ہاں ہے۔ پھر؟

سعید:۔ اس مرتبہ صاحبزادے نے مقابلہ کی ٹھانی۔ اور چونکہ ہم سے زیادہ رقم کی پیش کش کی لہذا ٹھیکہ انہیں دے دیا گیا

زید:۔ واقعی؟ اور مجھے آج خبر ہوئی ہے۔ تم سے غافل اور بے پرواہ ہو۔ پہلے کیوں نہ بتایا کہ میں کچھ دوڑ دھوپ کرتا۔ اس محکمہ کے بہت سے لوگ ہیں جو میرے خوانِ کرم پر پلتے ہیں۔ جن کی مالی امداد کرتا رہتا ہوں۔ جن پر میرے ہزاروں روپے قرض ہیں۔ جو کہیں نہ تقاضا کریں اُن کے پاس جاتا اور وہ میرا کام کر دیتے۔ لیکن اب فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔

سعید:۔ وہ تو صحیح ہے میرے آقا۔ لیکن ـــ

زید:۔ میں لیکن ویکن کچھ نہیں سُننا چاہتا۔ تمھاری اس غفلت نے مجھے ہزاروں روپے کا نقصان پہنچا دیا۔

سعید:۔ لیکن میرے آقا! میں کس طرح عرض کرتا۔ کل شام ہی کو یہ فیصلہ ہوا۔ میں دوڑا دوڑا آیا کہ صورت حال سے اطلاع دوں۔ معلوم ہوا آپ ابراہیم کے ہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ گیارہ بجے رات تک آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر چلا گیا۔

زید:۔ ہاں بھئی کیا کرتا؟ اگرچہ ابراہیم کے حرص و طمع سے میں بہت نالاں ہوں۔ لیکن بڑے پرانے اور گہرے تعلقات ہیں۔ کل اُس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ خود بُلانے آتا تو شاید نہ جاتا۔ لیکن اُس کی ماں آئی دعوت دینے۔ تو مجھے اس لیے مجبوراً جانا پڑا۔ آخر وضعداری اور صلہ رحم بھی تو کوئی چیز ہے۔

سعید: - یہ بھی اچھی رہی - جو ہماری جڑ کاٹتے اُنہی کے ساتھ ہم حُسن سلوک کریں
اس تقریب کے موقع پر آپ کا کچھ نہ کچھ خرچ ہو ہی گیا ہوگا۔

زبیدہ: - ہاں کیوں نہیں - لیکن اس سے کیا ہوتا ہے - یہ ایسی رسمیں ہیں جن سے مفر نہیں -؛ انہیں خوش و ناخوش بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

سعید: - اور یہ کوئی پہلی تقریب نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی یہ حضرت اس طرح کی کئی حرکتیں کر چکے ہیں - اب پانی سر سے اُونچا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ چاہے خوش ہوں یا خفا۔ میں اب ان باتوں کو نہیں برداشت کر سکتا۔

زبیدہ: - یہ تو ٹھیک ہے بھئی - لیکن سوال یہ ہے کہ اِس قسم کی باتوں سے ہم ان کو روک بھی کیسے سکتے ہیں۔ بھئی یہ تو کاروبار ہے ---- جو ---- جوڑ کر خود اٹھالے ہاتھ ہیں دینا اُسی کا ہے۔ ---- ؛ ہمیں تکلیف چاہے جتنی ہو نقصان خواہ کتنا ہی پہنچ جائے - لیکن سدِباب تو اپنے اختیار کی چیز نہیں

سعید: - کیوں نہیں ہے؟

زبیدہ: - کیا ہے؟ کیا کر سکتے ہو؟

سعید: - صرف آپ کی اجازت چاہیے - پھر دیکھیے کیا کرتا ہوں۔

زبیدہ: - اچھا تو اجازت ہے ---- لیکن بتا دو تمھارا پروگرام کیا ہے؟

سعید: - آج ہی ابراہیم کے گودام میں آگ لگوائے دیتا ہوں۔ یہ حضرت جو ملک التجار بنے گھوم رہے ہیں، کل ہی ایک ایک پائی کو محتاج نہ ہو جائیں۔ جب کہیے۔

زبیدہ: - ترکیب تو بہت معقول ہے لیکن میں اجازت نہیں دے سکتا۔

سعید: - وہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا آپ یہی کہیں گے۔

زید:۔ کیا کروں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں ـــــ کسی کو نقصان پہنچانا چاہوں تو بھی نہیں پہنچا سکتا۔

سعید:۔ بس، تو اس طرح رفتہ رفتہ وہ سارے کاروبار پر چھا جائے گا۔ اور ہم یونہی مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

زید:۔ مجبوری ہے ـــــ اور اگر ایسا ہوا بھی، تو بھی خدا کے فضل سے میرے پاس اتنا موجود ہے کہ میرا بچہ یوسف عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے گا۔

سعید:۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ابراہیم کو کھلی چھٹی ہے، ہمارے کاروبار پر چاہے قبضہ کر لے۔

زید:۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم چاہو تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

سعید:۔ وہ کس طرح میرے آقا! میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

زید:۔ چوکس رہو۔ جس طرح وہ رہتا ہے۔ بعد از وقت سوچنے سے کچھ بھی حاصل نہیں، یہ تو وہی بات ہوئی ـــــ ہر کہ بعد از جنگ یاد آید بکلہ خودی باید زد! ـــــ سچ پوچھو تو میں اب ابراہیم سے خوش نہیں ہوں اس کے چھوڑے پن نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔ اور میرے گاہکوں کی توڑ کر رہا ہے۔ میرے کاروبار پر چھا رہا ہے۔ میری تجارت چھین لینا چاہتا ہے، یہ سب بڑی رکیک اور چھوٹی باتیں ہیں۔ پھر بھی میں اس کا نقصان نہیں چاہتا۔ یعنی کم از کم اُس کے نقصان کا سبب میں نہیں بننا چاہتا۔

اتنے میں گھر کی خادمہ ننھے یوسف کو لے کر اُدھر سے گزری۔ بچہ انگوٹھا

چوس رہا تھا۔ باپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ زید اس تبسم کی تاب نہ لا سکا
اس نے سعید کو چھوڑا اور بچے کی طرف لپکا۔ اُسے گود میں لے کر ہمکنے
دینے لگا۔ بچے کے تبسم کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ زید کی
تلب بھی بڑھ گئی۔

---

(۹)

جنگ

ادھر سال بھر کے عرصہ میں پے در پے کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ ابراہیم نے جو کام بھی شروع کیا اُس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ زید کے کاروبار کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ اس طرح کے ہر ہر واقعہ پر سعید نمک مرچ لگا کر زید کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر میں ایک واقعہ ایسا ہوا کہ زید کے صبر و تحمل نے جواب دے دیا اور وہ مجبور ہو گیا کہ ابراہیم سے اپنے تعلقات یکسر منقطع کر لے۔

بات یہ ہوئی کہ شہر کے قریب زرخیز زمین کا ایک بہت اچھا اور بہت بڑا قطعہ تھا۔ زید کئی مہینے سے اُسے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن قیمت کی زیادتی کے باعث معاملہ پٹتا نہیں تھا۔ آخر بڑی مشکل سے اُس نے ایک لاکھ

درہم پر زمین کے مالک کو راضی کر لیا۔

زمین کے مالک نے کہا۔

اگر آپ ابھی اور اسی وقت مجھے بیعانہ میں چوتھائی رقم دے سکتے ہیں تو کل دستاویز کر دوں گا اور اگر بیعانہ نہیں دیتے تو کوئی دوسرا گاہک مل گیا تو اُسے دے دوں گا۔ ورنہ آپ تو ہیں ہی۔

یہ گفتگو رات کے کھانے کے بعد ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اُس وقت اتنی رات گئے پچیس ہزار درہم مہیا کر دینا زید کے لیے ناممکن تھا۔ پھر اس نے یہ بھی خیال کیا کہ رات بھر میں کون گاہک اسے ملا جاتا ہے، کل صبح اُٹھتے ہی اس معاملہ کو طے کر دوں گا، اُس کے گھر جا کر۔

چنانچہ بات ختم ہو گئی۔ گاہک واپس چلا گیا۔ اور زید گھر میں جا کر اطمینان سے سو رہا۔ صبح اُٹھنے کے بعد اُس نے سعید سے کہا کہ روپے کا انتظام کیے۔ سعید نے جلدی جلدی روپے کا انتظام کیا۔ اور دونوں خوشی خوشی مالک زمین کے ہاں پہنچے۔ وہ بڑی شگفتہ پیشانی سے ملا۔ زید نے کہا۔

لیجئے یہ پچیس ہزار درہم ——— کل انشاء اللہ باقی رقم بھی مل جائے گی۔ آپ کو!

مالک زمین نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"اب آئے ہیں آپ؟"

زید نے کہا۔

"ہاں ——— اعتراض ہے آپ کو کچھ؟"

وہ بولا۔

"زمین کا سودا تو ہو بھی گیا۔ آپ کے ہاں سے جب واپس ہوا تو گھر پہنچ کر دیکھتا کیا ہوں کہ ابراہیم بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی کئی مرتبہ اس زمین کے خریدنے کی خواہش ظاہر کر چکا تھا۔ میں نے اُس کے سامنے بھی یہی شرط رکھی۔ اور قیمت سوا لاکھ مانگی ——— وہ خدا کا بندہ توڑے سے کر آیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے سوا لاکھ درہم دے کر معاملہ کر لیا۔ دیکھئے ذرا سی چوک میں آپ کو نقصان پہنچ گیا۔ اور مجھے پچیس ہزار زیادہ مل گئے۔

یہ باتیں سُن کر زید کو سناٹا آگیا۔ اُس وقت اُس کے ابیش اور بلال کا یہ عالم تھا۔ کہ اگر ابراہیم سامنے ہوتا تو اُس کی خیر نہیں تھی! سعید کو بھی وار کرنے کا موقعہ مل گیا۔

دیکھ لیا آپ نے میرے آقا ——— یہ ہے آپ کے پالے ہوئے سنپولیے کی حالت۔ آپ ہی نے دُودھ پلا پلا کر پالا ہے اسے۔ اور دیکھئے آگے آگے کیا ہوتا ہے:

زید نے کہا۔

ہاں۔ میں نے اپنی غلطی محسوس کر لی۔ واقعی اِس شیطان کی سرپرستی اور امداد کر کے میں نے بہت بڑی غلطی کی۔

سعید:۔ لیکن اب اس اعتراف سے کیا ہوتا ہے ———؟ آپ ہیں کہ گھٹتے جا رہے ہیں۔ اور وہ ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے۔

زید اُٹھ کھڑا ہوا۔

چلو یہاں سے، ابراہیم کے گھر چلیں گے۔ اب واقعی پانی سر سے اُونچا ہو چکا ہے۔

آج دونوں کو بات کر لینی چاہیے۔

راستہ بھر سعید زید کو ابراہیم کے خلاف ورغلاتا رہا۔ زید کو آتا ہوا دیکھ کر ابراہیم سروقد پیشوائی کو اُٹھا۔ بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور اہلاً و سہلاً مرحباً کر خود مسند سے اُٹھ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا، اور صدر کی جگہ اس کے لیے خالی کر دی

زید نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آج میں تم سے قطع تعلق کا اعلان کرنے آیا ہوں۔ آج سے ہمارے تمھارے مراسم ختم۔"

ابراہیم نے بڑے ادب کے ساتھ پوچھا۔

"لیکن چچا جان میرا قصور؟ میری خطا؟"

زید :۔ تم احسان فراموش ہو۔ کمینے ہو، رذیل ہو۔ بداندیش ہو، کم ظرف ہو

ابراہیم :۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے تو ضرور یہ ساری خرابیاں میرے اندر موجود ہونگی۔ مجھ میں جرأت نہیں کہ انکار کر سکوں۔

سعید :۔ انکار کیسے کرو گے میاں صاحبزادے ——— آخر حد بھی ہے خباثت نفس اور شیطنیت کی۔

ابراہیم :۔ چچا جان کی بات اور ہے۔ لیکن آپ ذرا سوچ سمجھ کر الفاظ استعمال کیجیے۔ ورنہ ———

سعید :۔ ورنہ کیا مار ڈالو گے؟

ابراہیم :۔ ہاں ——— تم میری توہین کر کے زندہ نہیں رہ سکتے۔

یہ الفاظ اس نے کچھ ایسے تیور سے کہے کہ سعید سہم کر خاموش ہو گیا۔

زیدنے کہا۔
تم جب اس شہر میں آئے تھے، میں خوش ہوا تھا۔ میں نے تمھاری دعانداشی کی وادد ی تھی۔ میں نے تمہیں ہر قسم کی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ابراہیم:۔ اور میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ نے میری زیادہ سے زیادہ مدد کی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس شہر میں بود و باش اختیار کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور الحمدللہ کہ وہ توقع سے زیادہ حاصل ہوئی۔

زید:۔ مگر تم نے اس کا صلہ کیا دیا ؟

ابراہیم:۔ خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست ——— میں بھلا کیا صلہ دے سکتا تھا آپ کو؟

زید:۔ الفاظ سے نہ کھیلو۔ اگر صلہ نہیں دے سکتے تھے تو ممنونیت کا اظہار کس طرح کیا؟

ابراہیم:۔ میری گردن جھکی ہوئی ہے۔ اور یہ کبھی آپ کے سامنے نہیں اُٹھ سکتی

زید:۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تمھاری جھکی ہوئی گردن دیکھوں۔ اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ——— میں یہ چاہتا تھا کہ تمہیں ایک شریف اور نیک صفت انسان پاؤں۔ اور افسوس ہے کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

ابراہیم:۔ لیکن عم محترم میرا جُرم ——— اب تک میں ناواقف ہوں اس سے۔

زید :- بھولے نہ بنو۔ تم نے عزیز بن کر میری پیٹھ میں چھرا بھونکا۔ میری دولت ڈاکہ ڈالا۔ میری خوش حالی اور فارغ البالی کی جھپٹ لینے کی کوشش ہے —— کیا مجھے تم سے یہی توقع کرنی چاہیے تھی ؟

ابراہیم :- ہرگز نہیں —— لیکن میں نے تو یہ کچھ نہیں کیا۔ جو آپ فرما رہے ہیں

زید :- رہ رہی کے بیچے ہیں ! کیا تم ہی وہ نہیں جس نے ان باغات کا ٹھیکہ لیا جن پر برسہا برس سے میں قابض و متصرف تھا —— ! مروت بھی جگہ ہے۔ کیا اپنی حوصلہ مندی کے مظاہرے کے لیے تم کسی اور ٹھیکہ پر قسمت آزمائی نہیں کر سکتے۔

ابراہیم :- کاش مجھے علم ہوتا کہ آپ کا ان باغات سے تعلق ہے۔ ورنہ بخدا میں ایسی جرأت نہ کرتا۔

سعید :- اور وہ زمین —— ؟ اور بھی بہت سی باتیں ہیں، لیکن ہم انہیں ہیں۔ صرف زمین کا جواب دیجئے۔ وہ آپ نے کیسے خریدلی - ؟

ابراہیم :- کیسی زمین ؟ کس زمین کے بارے میں تم کہہ رہے ہو ؟ میں کسی زمین کا سودا کر چکا ہوں۔

زید :- وہ زمین جو کل رات تم نے سوا لاکھ درہم میں خریدی ہے۔

سعید :- کہہ دیجئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اسے خریدنے والے تھے !

یہ کہہ کر سعید نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔

ابراہیم نے کہا۔

ہاں واقعی نہیں معلوم تھا کہ چچا جان اسے خرید رہے ہیں۔ ورنہ کوئی ضرورت

نہیں حق کرنیں اس کا سودا کرتا"

زبیدہ:۔ جھوٹ ــــ غلط ــــ فریب ــــ!

ابراہیم:۔ خدائے عزیز و جلیل کی قسم میں غلط نہیں کہتا چچا جان ــــ مجھے کچھ علم نہیں تھا ــــ!

زبیدہ:۔ خیر میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔

ابراہیم:۔ میں بڑی خوشی سے اس پر آمادہ ہوں کہ آپ زمین لے لیں۔

سعید:۔ جی ہاں ــــ کیوں لے لیں؟ ہم اسے ایک لاکھ میں خرید رہے تھے آپ نے سوا لاکھ میں خرید لی۔ پچیس ہزار کا گھاٹا ہم کیوں برداشت کریں؟

ابراہیم:۔ نہیں گھاٹے کے بغیر۔

سعید:۔ یعنی ایک لاکھ میں!

ابراہیم:۔ ایک لاکھ میں بھی نہیں، بالکل مُفت ــــ چچا جان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ میں ان سے قیمت نہیں لے سکتا ــــ نذر کرتا ہوں انہیں ــــ!

زبیدہ:۔ میں خیرات نہیں لیتا۔ خدا کا دیا ہوا میرے پاس بھی بہت کچھ ہے۔

ابراہیم:۔ استغفراللہ ــــ میرے ذہن و دماغ کے کسی گوشے میں یہ سوال بھی نہیں آ سکتا۔

زبیدنے ابراہیم کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ غصّہ اور برہمی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سعید سے کہا۔

"چلو ــــ!"

پھر وہ ابراہیم سے مخاطب ہوا اور بڑی تلخی سے کہا۔

"بہر حال، میں فیصلہ کر چکا - اور وہ فیصلہ قائم رہے گا"

اور پھر ابراہیم کی کوئی بات سنے بغیر وفور طیش و غضب میں زبیدہ وہاں سے چلا گیا - اور ابراہیم کی صد ہا منتوں اور خوشامدوں کے باوجود نہ آیا۔ حتیٰ کہ جب ابراہیم کی ماں کا انتقال ہوا جب بھی نہ آیا۔

---

(۱۰)

اتفاقی ملاقات

سعید کی دراندازیوں اور فتنہ سامانیوں کے باعث اگرچہ زید اور ابراہیم میں اَن بن ہو گئی تھی۔ لیکن ابراہیم کا جہاں تک تعلق تھا، وہ وہ اب بھی زید کو اپنا بزرگ مانتا تھا۔ اس کے ادب و احترام اور توقیر و اعزاز میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا۔ پیٹھ پیچھے بھی اگر کوئی بات کبھی نکل آتی تھی تو وہ نہ صرف یہ کہ اُس کی بُرائی نہیں کرتا تھا، بلکہ اگر کوئی اُس کے بارے میں سخت سُست الفاظ استعمال کرتا تھا تو اس سے اُلجھ جاتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ اپنے گماشتوں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا، کچھ اور کاروباری لوگ بھی موجود تھے۔ ان سب کو معلوم تھا۔ کہ زید ابراہیم سے بہت خفا ہے۔ صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں۔ یہ بھی اُنھیں معلوم تھا کہ ابراہیم کا اُن کے ہاں آنا جانا بند ہو چکا ہے

لہٰذا ابراہیم کو خوش کرنے کے لیے فضل بن ربیع ایک گماشتہ نے کہا۔

"زید اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھنے لگا ہے۔ لیکن اسے ایسا سبق ملا ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی غیرت کا مادہ ہے۔ تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

یہ سُن کر ابراہیم کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُس نے پوچھا۔

"کیسے۔ ؟ کیا بات ہوئی ؟"

گماشتہ نے جواب دیا۔

کل امیر شہر کے دربار میں کسی کام سے وہ بھی آئے تھے اور میں بھی موجود تھا

ابراہیم :۔ مجھے معلوم ہے بڑے حکام رس اور رسا آدمی ہو۔ لیکن تم تو اپنی داستان کہنے لگے۔

گماشتہ :۔ جی ہاں۔ تو ہوا یہ کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ امیر شہر نے دریافت کیا، آج کل حلقۂ تجار میں دیانت داری کے اعتبار سے کون شخص مقبول عام ہے ؟ قبل اس کے کہ میں جواب دوں، زید کا وکیل سعید بول اُٹھا۔ ہمارے آقا سے بڑھ کر نہ صرف مرو میں بلکہ سارے عالم اسلام میں کوئی شخص دیانت و امانت کے اعتبار سے یکتا نہیں۔"

اب میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے کہا۔ "یا امیر! سعید جو کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ منہ دیکھے کی بات ہے۔ دوسرے، وہ زید کا ملازم اور نمک خوار بھی ہے۔ اُسے کہنا ہی یہ چاہیے۔ وہ اُس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا ہے۔"

امیر مُسکرایا، اور پوچھا۔

"اچھا تم بتاؤ ـــــ تمہاری رائے میں کس شخص کا نام لیا جا سکتا ہے ؟"

میں نے فوراً بغیر کسی تامل کے کہا
"ابراہیم سوداگر کے نام سے مرو کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس کی دیانت و امانت شرافت اور سخاوت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ دوست دشمن سب اس کے ثناخواں ہیں وہ صادق الوعد، صادق القول اور امین ہے۔" یہ سُن کر امیر نے گردن ہلائی - اور کہا۔"

ہاں ـــــ اگرچہ ہمیں ابراہیم سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ ہم ابھی نووارد ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابراہیم کی تعریف حدیث متواتر کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ صرف تم ہی سے نہیں اور بھی بہت سے آدمیوں سے ہم اس کی تعریف سُن چکے ہیں۔ ـــــ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس سے ملیں"۔
یہ سن کر زید آگ بگولا ہی تو ہو گیا۔ اس نے بڑی تلخی اور برہمی کے ساتھ کہا۔
"ابراہیم ـــــ ابراہیم ـــــ وہ ہے کیا ـــــ منم کردہ از پرستم داستان!
یہ سب میری جوتیوں کی طفیل ہے۔ کہ آج وہ ملک التجار بنا بیٹھا ہے۔ اگر میں نے اُسے ساٹھ ہزار درہموں کے توڑے نہ دیئے ہوتے تو آج وہ ایک غیر معروف اور فلاکت زدہ شخص کی طرح جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوتا۔"
پھر جب زید خاموش ہوا تو سعید بول پڑا
"وہ ابراہیم تھا جس کی ہر موقع اور ہر مرحلہ پر میرے آقا نے مدد کی۔ مرو میں اس کے بننے اور فروغ پانے کا باعث ہی میرا آقا ہے۔ ورنہ وہ قیامت تک اس شہر میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔"
میں کیوں چُپ رہتا بھلا، میں نے تڑسے جواب دیا۔

لوگوں کو اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا خوب آتا ہے۔ وہ بھی دوسروں کے چہرے
اگر ان باتوں میں صداقت کا شائبہ بھی تھا تو کبھی ابراہیم کے سامنے یہ باتیں نہ
ہوتیں تو ہم جانتے۔"

زید بگڑ گیا۔

"تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں ——— اب تک میں خاموش تھا۔ اب کہتا ہوں
کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ میرا ہی پروردہ ہے۔ اگر میں نے اُسے سہارا
ہوتا تو واقعی آج اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔

میں نے کہا

بڑے میاں تم سٹھیا گئے ہو۔ تم جھوٹے ہو۔ تم امیر پر اپنی عظمت کا سکہ
چاہتے ہو۔ ورنہ ——— ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں ——— ہم سے
بڑھ بڑھ کر باتیں بناؤ گے ہم سب کچھ جانتے ہیں۔"

اس کے جواب میں سعید اور زید دونوں کچھ کہنے کے لیے آمادہ ہوتے ہی
کہ امیر نے کہا۔

"میں ایک مردِ معقول کی بُرائی زیادہ دیر تک نہیں سُن سکتا۔ اتنی دیر سے
کو بُرا بھلا کہا جا رہا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے مانے لیتا ہوں وہ کچھ نہ تھا اور یہاں مر
آکر بڑھا۔ اور اُس کی یہ ساری ترقیاں رہینِ منت ہیں۔ ہمارے دوست زید کی
اولوالعزمی، انسانیت نوازی اور حُسنِ اخلاق کی، پھر اس سے ابراہیم کی امانت
دیانت پر کیسے حرف آسکتا ہے ——— ؟ کیا ایک ایسے شخص کو ترقی کرنے کا
نہیں جو کسی دوسرے شخص کے سہارے آگے بڑھا ہو۔"

یہ سُنکر اوس پڑ گئی ۔ زید اور سعید دونوں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ بغلیں جھانکنے لگے۔ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ اور مزید لطف اس وقت آیا جب امیر یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

آج کی اِن باتوں سے ہمیں بہت تکلیف پہنچی۔ ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ اس قسم کی باتیں ہمارے سامنے چھیڑی جائیں دربار برخاست !

یہ کہا اور دارالامارۃ سے حرم میں چلا گیا۔

گھڑوں پانی پڑ گیا ان دونوں پر

یہ کہہ کر گماشتہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ابراہیم بڑی سنجیدگی سے یہ ساری باتیں سُن رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا"

گماشتے نے حیرت اور استعجاب سے پوچھا۔

"کیا غلطی ہوئی مجھ سے ؟"

ابراہیم نے کہا۔

کیا ضرورت تھی تمہیں سعید سے اُلجھنے کی ! اور اگر اُس سے اُلجھے بھی تھے۔ تو اُن الفاظ سے مخاطب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جن کا تم نے ذکر کیا۔

گماشتہ :۔ جو جیسی کہے گا، ویسی سُنے گا۔

ابراہیم :۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ زید اور سعید نے میرے بارے میں جو کچھ کہا۔ وہ صحیح تھا!

گماشتہ :۔ یعنی آپ اُن کے پیرو ہیں ؟

ابراہیم :۔ ہاں

گماشتہ :- اُنھوں نے ساٹھ ہزار درہم دے کر آپ کو بچنے کا موقع دیا!

ابراہیم :- ہاں بالکل سچ

گماشتہ :- وہ سہارا نہ دیتے تو آپ گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہوتے

ابراہیم :- اور کیا تم نہیں جانتے وہ میرے محسن ہیں میرے بزرگ ہیں

والد مرحوم کے دوست ہیں ۔ نہ اُن کے ساتھ میں کسی قسم کی بے ادبی کر سکتا ہوں

نہ یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ میرا کوئی آدمی یا دوست ان کی توہین کرے بزرگ کی

عزت ہر حالت میں کی جاتی ہے ۔

گماشتہ :- اور اگر بزرگ خود اپنی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جائے تب؟

ابراہیم :- تب بھی ۔

گماشتہ :- یہ عجیب فلسفہ ہے !

ابراہیم :- عجیب نہیں عجیب تر سمجھ لو ۔ لیکن بات وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں

گماشتہ :- گویا میں نے آپ کی تائید اور حمایت میں جو کچھ کہا وہ غلط تھا ۔ بلکہ

لغو تھا — ؟

ابراہیم :- ہاں میرے دوست یہی بات ہے !

گماشتہ :- یہ بدلہ دیا ہے آپ نے میری دوستی کا ۔

ابراہیم :- تم خفا ہو گئے ۔ حالانکہ میں توقع کرتا تھا تم مجھے سمجھنے کی کوشش کروگے

گماشتہ :- کوشش کر لی ، اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا ۔

ابراہیم :- چاہے جتنا خفا ہو ۔ لیکن میں حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ تمھاری

اس دوستی کے مظاہرے نے مجھے تکلیف پہنچائی ۔ تم نے جس دوستی کا ثبوت دیا

وہ ہے جس کو نادان کی دوستی کہا جا سکتا ہے۔

گماشتہ :- بس معاف کیجئے، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ خفگی کے عالم میں جانے کے لیے اُٹھا۔ ابراہیم نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

ابراہیم :- کہاں چلے؟

گماشتہ :- بہت دیر بیٹھا۔ اب اجازت دیجئے۔

ابراہیم :- نہیں میری معذرت قبول کر لو، پھر جانا۔

پھر ابراہیم نے از اوّل تا آخر گماشتہ کو اپنے اور زید کے تعلقات کی داستان سُنا ڈالی۔ وہ ساٹھ ہزار درہم بھی بتا دیئے کہ کیسے تھے اور کیونکر ملے؟ یہ ساری روداد سُن کر گماشتہ نے کہا۔

"لیکن ان باتوں سے بھی آپ ہی کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ زید کی نہیں۔

ابراہیم :- یہ کیونکر بھائی؟

گماشتہ :- زید نے جو رقم آپ کو دی وہ آپ ہی کی تھی۔ زید نے اپنے کاروبار میں آپ سے خوب کمایا۔ پھر اگر آپ کو بحال نادار پاکر تھوڑی سی اخلاقی مدد کر دی تو اس کا اتنا ڈھنڈورہ پیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔

ابراہیم :- بھائی یہ تو ان کا فعل ہوا۔ مجھے اُن سے بحث نہیں۔ میں یہ نہیں دیکھتا دوسرا کیا کر رہا ہے۔ صرف یہ دیکھتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔

تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد گماشتہ چلا گیا۔ اور ابراہیم اپنے کام میں مصروف

ہو گیا۔

مغرب کے بعد وہ اپنے گھر سے اُٹھا، اور ایک شخص عبید بن رحمٰن کے ہاں پہنچا۔ آج عبید نے اُس کی دعوت کی تھی۔

عبید بھی مرد کے بڑے کامیاب تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور یار باش آدمی تھا۔ مہینے میں کم از کم دو مرتبہ ضرور اپنے خاص خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کرتا تھا۔ کھانے کے بعد کچھ رقص و موسیقی اور بنید کی محفل جمتی تھی۔ اور تقریباً ساری رات اسی طرح رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں۔ وہ ابراہیم کو کئی مرتبہ اپنی محفلِ شبینہ میں مدعو کر چکا تھا لیکن عجیب اتفاق کہ ہر بار ابراہیم کو کسی نہ کسی مصروفیت کے باعث معذرت پر مجبور ہونا پڑا۔ آج پھر اس نے بڑے اصرار سے دعوت کی تھی اور کہا تھا۔

"دیکھو اگر تم آج بھی نہ آئے تو میرے تمہارے تعلقات منقطع ہو جائیں گے بھلا یہ کہاں کی بات ہے ہم بلائیں اور تم نہ آؤ۔"

اور ابراہیم نے وعدہ کر لیا تھا۔

"خواہ کیسا ہی ضروری کام ہو آج ضرور آؤں گا۔ تمہیں خفا نہیں ہونے دوں گا۔"

چنانچہ ضروری مصروفیتوں سے فارغ ہو کر مغرب کے بعد ابراہیم عبید کے ہاں پہنچ گیا۔

عبید نے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے اُس کا استقبال کیا۔

اہلاً و سہلاً ـــــ ابراہیم میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے وعدہ پورا کیا اور اگر آج بھی تم نہ آتے تو بخدا مجھے بہت رنج ہوتا۔"

پھر اُس نے اُن تمام لوگوں سے ابراہیم کا نہایت تعریفی الفاظ میں تعارف کرایا جو اُس وقت تک آ چکے تھے۔ تقریباً سب ہی ابراہیم سے اور اس کی شخصیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ سب نہایت گرم جوشی سے ملے۔ ان سب سے مل کر ابراہیم مشکل سے اپنی جگہ پر بیٹھ پایا ہوگا۔ کہ اُسے زید آتا نظر آیا۔ اُسے آتا دیکھ کر ابراہیم سروقد تعظیم کو اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ حبیب نے وہیں سے آواز دی۔

"ہاں میں جانتا ہوں تم زید کا کتنا احترام کرتے ہو —— اور وہ ایں بھی احترام اور عظمت کے لائق۔"

اتنے میں زید ابراہیم کے پاس آ چکا تھا۔ ابراہیم نے ایک تبسّم کے ساتھ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن زید نے ہاتھ جھٹک دیا اور مصافحہ نہیں کیا بمشکل یہ تھی کہ صرف ابراہیم ہی کے پاس اُس کی نشست تھی۔ کبھی وہ سوچتا تھا۔ واپس چلا جاؤں کبھی سوچتا تھا نہ جاؤں۔ ابراہیم نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"عم محترم تشریف تو رکھیے !"

چاروناچار زید کو بیٹھنا پڑا۔ لیکن تکدّر اور تنغّص اس کے چہرے سے ظاہر تھا ماتھے پر شکن، چہرے پر خشکی، انداز و اطوار میں رعونت بھی اور برہمی بھی۔ ابراہیم نے اس کے بیٹھ جانے کے بعد کہا۔

"چچا جان! مجھے معذرت کرنی ہے آپ سے۔"

زید۔ کیسی معذرت —— ؟ معذرت کا سوال ہی کیا —— جب میں تم سے کسی قسم کا علاقہ نہیں رکھنا چاہتا

ابراہیم :- وہ تو صحیح ہے۔ لیکن معذرت مجھے اس کی کرنی ہے کہ کل امیر شہر کے ہاں میں آپ سے میرے گماشتہ نے جو گفتگو کی، اس کا مجھے بہت صدمہ ہے میں نے اُسے سختی سے ڈانٹا، اور ان تمام باتوں کی تصدیق کر دی جو آپ نے وہاں فرمائی تھیں۔

زید : یعنی ——؟

ابراہیم :- یعنی یہ کہ میں آپ کا پروردہ ہوں۔ آپ کے سہارے نے مجھے ترقی کے مواقع بہم پہنچائے۔ آپ کی سرپرستی سے میں نے فائدے اُٹھائے بڑے نازک موقع پر آپ نے مجھے ساٹھ ہزار درہم دیئے۔ اس رقم سے میں نے اپنے حالات سدھارے —— ان سچائیوں کا انکار کیونکر ممکن تھا، چچا جان ——!

زید :- تو اُس نے ایک کی دس دس لگائیں جا کر —— میں تو پہلے ہی سے سمجھ رہا تھا۔ لیکن اُس نے میرا کیا بگاڑ لیا۔ اور تم کیا بگاڑ لو گے۔

ابراہیم :- عم محترم! آپ یقین فرمائیے۔ میں نے اُسے بہت بُرا بھلا کہا۔ وہ میرے اور آپ کے تعلقات سے ناآشنا تھا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ آپ کون ہیں میں کیا ہوں۔ آپ اتنا تو یقین کر لیجئے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

زید :- مجھے اس سے کوئی بحث نہیں۔ تم سچے ہو یا جھوٹے —— صاف بات یہ ہے کہ نہ اب میرا تم سے کوئی تعلق ہے۔ نہ کسی قسم کا ربط —— تم اپنے گھر خوش، میں اپنے گھر خوش۔

زید کو یہ بات سخت ناگوار گذر رہی تھی۔ کہ وہ ابراہیم کے پاس بیٹھا ہے۔ ہوئے

کچھ ایسی ہی تھی کہ نہ وہ خود واپس جا سکتا تھا ۔ نہ ابراہیم کو یہاں سے ہٹا سکتا تھا ۔ جبکہ میزبان تھا ۔ اس پر دونوں کا احترام لازم تھا ۔ وہ بھی اس معاملہ میں دخل نہیں دے سکتا تھا ۔

چار و ناچار بڑی کلفت کے ساتھ زید بیٹھا رہا ۔ لوگ نبیذ کے جام پی رہے تھے اور وہ خونِ جگر پی رہا تھا ۔

---

(۱۱)

دو معصوم دوست

بارہ سال کی مدت پلک جھپکتے گزر گئی

زید نے اپنے بیٹے کا نام سکینہ کے اصرار پر یوسف رکھا تھا۔

زید تو خیر چاہتا ہی تھا، لیکن سکینہ تو اُس سے عشق کرتی تھی۔ پہلے دن سے اس نے اُسے یوسف کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ یہ میرا یوسف ہے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے ..... پایا ہے۔ اسے۔

یوسف کی تعلیم و تربیت کی طرف زید اور سکینہ دونوں نے بڑی توجہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ گھر اور مدرسہ ہر جگہ اس کی شائستگی کا چرچا تھا۔ لوگ اس کی تمیز، ادب کے ثنا خواں تھے۔

جس مدرسہ میں یوسف تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اُسی مدرسہ میں صالح بھی پڑھتا تھا۔

صالح ابراہیم کا لڑکا تھا۔ یوسف اور صالح تقریباً ہم عمر تھے۔ مشکل سے تین چار مہینے کی چھوٹائی بڑائی ہو گی دونوں میں۔ دونوں کا مدرسہ ایک تھا، درجہ ایک تھا۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونو ایک دوسرے پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ زید اگرچہ ابراہیم سے اتنا بیزار تھا، کہ اُس کی صورت دیکھنے تک کا روادار نہ تھا۔ لیکن صالح سے وہ بھی بڑی شفقت کا برتاؤ کرتا تھا۔ جب یوسف اسے اپنے گھر لے آتا تھا۔ زید کئی کئی دن اُسے واپس نہیں جانے دیتا تھا۔ ابراہیم بہر حال زید کی عزت کرتا تھا، خاموشی کے سوا اس کے لیے کوئی اور چارہ نہیں تھا اور ایک اعتبار سے وہ خوش بھی تھا۔ اس کا خیال تھا۔ میں زید چچا کو خوش نہیں کر سکا، ان کی برہمی دُور نہیں کر سکا۔ ممکن ہے صالح کی معصومیت اس خلیج کو پاٹ سکے۔ جو ہم دونوں میں محض سعید کی ورتاندازی کے باعث پیدا ہو چکی ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوتا تھا، کہ زید نے صالح کو اپنے ہاں روک لیا ہے تو وہ مغموم اور برہم ہونے کے بجائے خوش ہوتا تھا۔

خود ابراہیم بھی کبھی کبھی یوسف کو اپنے ہاں براہ راست مدرسے سے لے آیا کرتا تھا۔ اور کئی کئی دن اسے اپنا مہمان بنا کر رکھتا تھا۔ لیکن کیا مجال تھی کہ زید نے یا سکینہ نے کسی قسم کا اعتراض کیا ہو۔ ویسے دونوں کی یہ حالت تھی کہ پل بھر کے لیے بھی یوسف کی جُدائی گوارا نہیں کی۔ لیکن ابراہیم کے ہاں وہ چار چار دن بھی اگر رہ جاتا تھا۔ تو کسی کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا ——— یہ عجیب دشمنی تھی ——اور عجیب تر اعتماد۔

یوسف اور صالح کے باہمی ربط ضبط کا یہ عالم تھا۔ کہ اگر کبھی کسی وجہ سے کسی

دن کوئی سکول نہ آتا، تو دوسرے کے لیے مدرسہ کا وقت پورا کرنا مشکل ہو جاتا اور مدرسہ ختم ہوتے ہی طالب خیریت کے لیے وہ اُس کے گھر پہنچتا۔

ان دونوں کی یہ ہم عمری اور معصومیت کی دوستی استادوں کو بھی بہت عزیز تھی۔ اُستاد عمران بن حسین اکثر ان دونوں کو چھیڑا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُن کا نام "ناصح غ" رکھا تھا۔ وہ ح سے پوچھتے غ کہاں ہے! اور غ سے دریافت کرتے آج ح نے آنے میں دیر کیوں کر دی ہے ۔؟

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اُستاد عمران بن حسین ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ لڑکوں سے بیکار تو بیٹھا نہیں جاتا، اُنھوں نے غل و شور اور ہنگامہ کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ آج صالح بھی بہت ترنگ میں تھا۔ اُس نے اُستاد کی نشست گاہ پر جو مسند بچھی تھی اُس میں بڑی خوبی سے ایک کانٹا پیوست کر دیا۔ اس طرح کہ اُن کی نظر کسی طرح نہ آسکے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اُستاد عمران بن حسین تشریف لائے تو انھیں دیکھتے ہی تمام لڑکے ادب و احترام کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اُستاد عمران بن حسین مسند پر بیٹھے ہی تھے۔ کہ صالح کا لگایا ہوا کانٹا بُری طرح چبھ گیا۔ بلبلا ہی تو گئے ویسے ہی تند مزاج آدمی تھے۔ اب تو اُن کا جلال انتہا کو پہنچ گیا۔ اُنھوں نے کانٹا ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

یہ کس کی حرکت ہے ۔۔۔؟

مدرسہ بھر پر سناٹا چھا گیا۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ غضب ناک اُستاد کے

سوال کا جواب اثبات میں دیتا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ اُستاد کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے، لیکن مجرم کو نہ پاکر پھر واپس آجاتا ہے۔ اُستاد عمران کو اس حالت میں دیکھ کر سب ہی لرزاں و ترساں تھے۔ خاص طور پر صالح کی حالت سب سے زیادہ غیر تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، اُس نے جُرم کیا ہے۔ اور اس کا جُرم افشا ہونے ہی والا ہے، پھر اس کی خیریت نہیں۔

یکایک اُستاد عمران کی آواز فضا میں گونجی۔

جس کسی نے یہ حرکت کی ہو وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو جائے؟

لیکن کوئی سامنے آنے کی جُرأت نہ کر سکا۔

اُستاد نے کہا

اگر مجرم میرے سامنے آجائے گا تو اُس کے ساتھ رعایت کروں گا سزا تو اس گستاخی اور بے ادبی کی ضرور ملے گی۔ لیکن اگر وہ نہ آیا، اُس نے اعترافِ جُرم نہ کیا تو عبرت انگیز اور سبق آموز سزا ملے گی۔

اس اعلان کے بعد بھی کوئی سامنے نہ آیا ــــــ کس میں اتنی ہمت تھی اب اُستاد عمران کو ڈالے کر کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے فرمایا

"مجرم اقرار نہیں کرتا، بہر حال مجرم ایک ہی ہے۔ اور اسی درجہ کا ہے، بہتر یہ ہے کہ تم لوگ نشان دہی کر دو۔

صالح کی دولت و ثروت، اس کے اثر و رسوخ، ہم درجہ طلباء کے ساتھ اس کے حسنِ سلوک، مروّت اور محبّت کے برتاؤ سے سب واقف تھے سب ممنون تھے۔ کہ کہ ممکن تھا کہ کوئی اس کی شکایت کر دیتا، کوئی اس کی نشان دہی کر دیتا

کہ دیکھئے یہ ہے مجرم ۔ سب خاموش ہو رہے ۔

اب استاد عمران نے کوڑا ہلایا اور کہا ۔

اگر تم لوگ نہیں بتاتے تو تم سب کو سزا ملے گی ۔۔۔۔۔! اس لیے کہ جرم کو چھپانے والا بھی مجرم ہی ہوتا ہے ۔

یہ کہہ کر انھوں نے کوڑا گھمایا ۔

تمام طلباء کے چہرے دہشت کے باعث سفید پڑ گئے ۔ لیکن زبانیں اب بھی خاموش تھیں ۔

ہر ہر لحہ استاد کا غصہ بڑھ رہا تھا ۔ طوفان کی صورت اختیار کر رہا تھا اب اس نے ڈپٹ کر اور کوڑا فضا میں بلند کر کے صف کے پہلے طالب علم سے پوچھا ۔

"بتاؤ ۔۔۔۔ ورنہ کوڑا اس زور سے پڑے گا کہ پیٹھ کی کھال اُدھڑ جائے گی۔"

شافع کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا ۔ اس نے صالح کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

"یہ تھے !"

قبل اس کے کہ استاد، صالح کی طرف متوجہ ہو، دفعتہً یوسف اٹھ کھڑا ہوا اس نے کہا ۔

شافع اور صالح سے اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے ۔ اس لیے یہ جھوٹ بول رہا ہے ۔

استاد کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا ۔

صالح کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور شافع کا چہرہ دہشت کے باعث سفید پڑ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر اُستاد نے یوسف کی بات صحیح سمجھ لی تو پھر میری خیر نہیں۔ ساتھ ہی میں بے وفائی کے سبب الگ متہم ہونا پڑا اُستاد کی نظر میں الگ جھٹا ہوا۔ سزا الگ ملی۔

اُستاد نے یوسف سے پوچھا۔

"پھر کون تھا؟ کس کی تھی یہ حرکت؟"

یوسف نے کہا۔

"یہ تقصیر مجھ سے سرزد ہوئی۔"

یوسف اور صالح اُستاد کو بہت عزیز تھے ذکاوت و ذہانت، ادب و تمیز شائستگی اور معصومیت کے باعث انھوں نے اُستاد عمران پر اپنا سکہ بٹھالیا تھا۔ اُستاد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔

لیکن مجرم خود اقرار کر رہا تھا۔ اسے جھٹلایا کیسے جا سکتا تھا۔

استاد عمران یوسف کی خاندانی وجاہت سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ یہ لڑکا، ان مستثنیٰ لڑکوں میں ہے جو کبھی اور کسی حالت میں بھی مارے پیٹے نہیں جا سکتے۔ اور اگر کوئی اُستاد ایسی ناروا حرکت کرے تو پھر اُس کے مستقبل اور ملازمت کی خیریت نہیں۔ لیکن اب ذاتی وقار کا سوال تھا۔ اُستاد عمران کو اپنی ملازمت عزیز تھی۔ لیکن وقار اس سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ غریب آدمی تھے۔ اور دولت مندوں کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن اگر ان کی آن کا سوال آجائے تو پھر وہ لنگوٹی میں

پھاک کھیلنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مستقبل کے ہر خیال سے بے
ہو کر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ یوسف کو اس بدتمیزی کی سزا ملنی چاہیے۔ انھوں نے
برہمی کے ساتھ پوچھا۔

"یہ حرکت تم نے کیوں کی؟"

وہ بولا۔

"غلطی ہوئی۔ ندامت سے میرا سر جھکا ہوا ہے اب کبھی ایسی غلطی نہ ہوگی۔"

استاد نے پیکر جلال بن کر کہا۔

"تم نے غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس لیے سزا تمھیں ہلکی ملے گی۔ لیکن تم اس سے
بچ نہیں سکتے۔"

یوسف نے سر جھکا کر عرض کیا۔

"بر سر و چشم ——— جب مجھ سے ایک غلطی سرزد ہوئی تو اس کی سزا کے لیے
میں تیار ہوں۔"

استاد عمران کا کوڑا پھر فضا میں بلند ہوا اور یوسف کی پیٹھ پر پے در پے تین
مرتبہ پڑا۔

یہ ہلکی سزا بھی یوسف جیسے ناز و نعم میں پلے ہوئے لڑکے کے لیے بہت سخت تھی
ہر ہر کوڑے پر وہ بلبلا جاتا تھا۔ ہونٹ بھینچ لیتا تھا۔ لیکن چہرے کے اضطراب
خلش کا چھپانا ناممکن تھا۔

درجہ کے دوسرے طلباء یہ منظر مبہوت و ششدر کھڑے دیکھ رہے تھے۔

صالح ———؟

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کوڑے یوسف کی پیٹھ پر نہیں، اس کے دل پر پڑ رہے ہیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، وہ بازی لے گیا، اور یہ صرف ایک تماشائی کی طرح یہ دل دوز اور جگر فگار منظر دیکھتا رہا۔

خود اُستاد عمران بھی اس واقعہ سے اتنا متاثر تھے کہ اُن سے پڑھایا نہیں گیا شاگردوں کو انھوں نے چھٹی دے دی، اور خود گھر چلے گئے۔

اُستاد عمران کے چلے جانے کے بعد ساتھیوں نے اُسے گھیر لیا اور اُس کے گرد جمع ہو گئے

شافع نے کہا۔

"میرے دوست یہ تم نے کیا کیا؟"

یوسف نے جواب دیا۔

"میں صالح کی پٹائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی طرح بھی نہیں!"

صالح اس کے پاس کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر ہمت یارا نہیں کرتی تھی۔

اُسے اِس حالت میں دیکھ کر خود یوسف نے تسلی دی۔

صالح میرے دوست تم رو کیوں رہے ہو؟ ——— مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ تمھیں پٹتا دیکھوں ——— ہونہہ ——— تمھاری مار میں نے برداشت کر لی اور اگر تمھیں ایسا ہی قلق ہے تو اگر کبھی مجھ سے اس طرح کی غلطی ہو تو تم اسے

اپنے سر اوڑھ لینا۔

صالح نے اسے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب یوسف کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں۔

---

(۱۴)

استاد کا انعام

یوسف اور صالح کی دوستی یوں ہی پروان چڑھتی رہی۔

دن گزرتے گئے۔

صالح یوسف کے ایثار سے بہت متاثر تھا ——— بڑی عمر کے لوگ بھی دوستی کا نباہ اس طرح نہیں کر پاتے، جس طرح یوسف نے کر دکھایا۔

دوسرے دن ایک اور دل چسپ واقعہ پیش آیا۔

اُستاد عمران بن حسین حسب معمول پڑھانے کے لیے تشریف لائے۔ انھیں دیکھتے ہی لڑکے سہم کر بیٹھ گئے۔ کل اُنھوں نے جس جبروت و جلال کا اظہار کیا تھا اس سے سب واقف تھے۔ لیکن آج اُن کے چہرے پر کسی قسم کی تلخی اور بدمزگی کے آثار نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ بھول چکے ہیں۔ بہت خوش اور مسرور نظر آ رہے تھے۔ اُنھوں نے آتے ہی شافع کو بُلایا۔ وہ دل میں بہت ڈرا

خدا جانے کیا بات ہے؟ لیکن سامنے پہنچا۔

اُستاد:۔ تم نے کل صالح کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا۔

شافع:۔ یا استاد ——— جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ جسے سزا ملنا تھی مل چکی

پھر آپ کیوں دریافت فرما رہے ہیں؟

اُستاد:۔ اس لیے کہ مجھے بہت عجیب و غریب اطلاع ملی ہے ——— بتاؤ کیا تم

نے سچ کہا تھا؟

شافع:۔ جی ہاں ——!

پھر اُستاد عمران بن حسین نے صالح کو مخاطب کیا۔ وہ آیا۔ اُس سے بڑی شفقت

کے ساتھ پوچھا

"کیا وہ شرارت تمہارے ہی زرخیز ذہن و دماغ کا نتیجہ تھی؟

صالح تھرا گیا اور خاموش کھڑا رہا۔

اُستاد:۔ تم ڈرو نہیں، میں صرف سچی بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مقصد سزا

نہیں صرف معلوم کرنا ہے۔

صالح:۔ جی ہاں، وہ غلطی مجھی سے سرزد ہوئی تھی۔

استاد:۔ اس غلطی میں کون کون شریک تھا؟

صالح:۔ کوئی نہیں۔

استاد:۔ یوسف ——! کیا وہ بھی تمہارا شریک نہیں تھا؟

صالح:۔ بالکل نہیں ——— بلکہ اُس نے مجھے منع کیا تھا۔

استاد:۔ اُس نے منع کیا تھا کہ تم ایسا نہ کرو۔

صالح :- یا اُستاد یہی بات ہے ـــــ! اس نے منع کیا تھا

اُستاد :- پھر بھی تم نے ایک افسوس ناک حرکت کا ارتکاب کیا؟

صالح :- بہت نادم ہوں اس غلطی پر۔ زندگی بھر نادم رہوں گا۔ یوسف کے ایثار نے میری ندامت کو بہت زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔

اُستاد :- اچھا جاؤ، اپنی جگہ بیٹھو ـــــ یوسف اِدھر آؤ۔

یوسف آکر سامنے کھڑا ہو گیا۔

اُستاد :- (شفقت کے ساتھ) تم نے صالح کی خطا اپنے سر کیوں اوڑھ لی؟

یوسف :- اس لیے کہ وہ میرا دوست ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اُسے سزا ملے۔

اُستاد :- تم اُس کی سفارش کر سکتے تھے۔

یوسف :- بجا طور پر آپ بے حد غصّہ میں تھے۔ اس حالت میں آپ سے سفارش کی جرأت ناممکن تھی۔

اُستاد :- لیکن دوسرے کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی عزیز دوست ہو۔ کیا اس طرح اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا مناسب ہے؟

یوسف :- میرے دل کا فیصلہ یہی تھا۔

اُستاد نے یوسف کی پیٹھ پر شفقت و محبت کا ہاتھ پھیرا، پھر کہا۔

"شاباش ـــــ میرے دل میں تمھاری عزّت پیدا ہو گئی ہے۔ درجہ کے تمام طلبا کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہیے۔"

یوسف کے ایثار نے صالح کے دل میں سچی ندامت کا جذبہ پیدا کیا۔

پھر اُستاد نے ایک بڑی درد بھری تقریر کی۔ اُنھوں نے اپنے شاگردوں کو نصیحت کی کہ یہ دُنیا چند روزہ ہے۔ یہاں ہمیں ایسے کام کرنے چاہئیں۔ جو یادگار رہیں۔ جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچ سکے۔ ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیئے جن سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ اور جو بُری مثال بن کر دنیا کے سامنے زندہ رہیں۔

پھر اُستاد نے کہا۔

"کل مدرسہ سے باہر جاتے وقت اتفاقاً میں نے ایک لڑکے کی سرگوشی سُنی جو اپنے ایک ساتھی سے اس واقعہ کا ذکر کر کے حسرت اور افسوس کے لہجے میں یوسف کی پٹائی کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا یہ سرگوشی صحیح ہے۔ میں سیدھا یوسف کے والد اور اپنے دوست زید کے ہاں پہنچا اور اُنھیں سارا ماجرا سُنا کر انھیں مبارک باد دی کہ وہ اتنے اچھے اور نیک سیرت لڑکے کے باپ ہیں۔ پھر میں نے تاکید کی کہ وہ یوسف سے اُس وقت اس واقعہ کا ذکر نہ کریں۔ جب تک میں اسے انعام نہ دے دوں۔"

پھر اُنھوں نے یوسف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بیٹے میں ایک غریب الزمان ہوں۔ تم دولت مند باپ کے بیٹے ہو۔ تمھارے گھر سے مجھے روپے ملتے رہتے ہیں۔ میں تمھیں کوئی ایسی مادّی چیز نہیں دے سکتا جو درہم و دینار کے ذریعہ خریدی جا سکتی ہو ——— مگر ہاں ایک چیز ——— !"

پھر اُنھوں نے ایک قرآن شریف کا نسخہ یوسف کے ہاتھ میں دیا اور کہا۔

"ہر روز وضو کر کے میں اسے اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ کئی برس کی محنت کے بعد یہ نسخہ کل ہی اتمام کو پہنچا ہے۔ یہ میری محنت اور عقیدت کا ثمرہ ہے۔ اسے محبت

اور خلوص کے ساتھ میں اپنے عزیز شاگرد کو نذر کرتا ہوں۔"

یوسف نے وہ نسخہ لے لیا۔ اور تاثر سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ اتنا بڑا انعام ہے۔ جس کی میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا، یہ میرے خاندان میں ایک متبرک تحفہ کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ جب بھی اسے دیکھوں گا میری عقیدت، خلوص اور سچائی میں اضافہ ہوگا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کی ہدایات اور نصیحات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

---

(۱۳)

اشکِ ندامت

زید ایک اچھا انسان تھا۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ رحم دل تھا۔ سخی تھا۔ خدا ترس تھا۔ نیک تھا۔ لیکن کینہ ساز بھی تھا۔ بڑی دیر خفا ہوتا تھا۔ لیکن جب خفا ہو جاتا تھا تب معاف نہیں کرتا تھا۔ خفگی اگر بے وجہ ہوتی تو بھی اپنی وضعداری پر قائم رہتا تھا۔ سعید کی دراندازیوں نے اُسے ابراہیم سے برگشتہ کر دیا۔ لیکن ابراہیم کی مسلسل سعادت مندیوں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اُس نے رائے قائم کرنے میں غلطی کی تھی۔ اس نے سعید کے کہنے سے جو رویہ اختیار کر رکھا وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ضمیر کے اسی تاثر اور شرمندگی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ صالح سے غیر معمولی محبت کرنے لگا تھا۔

اے گل نیلوفر بنو خرسندم تو بوئے کسے داری!

وہ اس التفات و محبت سے اس داغ کو دھو دینا چاہتا تھا۔ جو اُس نے ابراہیم

جیسے ناکردہ گناہ کے ساتھ تلخ رویہ اختیار کر کے خود اپنے دامن پر لگایا تھا۔
لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس پر تیار نہیں تھا کہ ابراہیم کو معاف کر دے۔
اس سے تعلقات پھر استوار کر لے۔ گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط پر عمل کرے۔
شاید ابراہیم اس کی اس اندرونی خلش کو محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے وہ ایک
طرف تو اپنی سعادت مندیوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ دوسری طرف وہ
صالح اور یوسف میں زیادہ سے زیادہ تعلقات کے ہموار کرنے میں ممد و معاون ثابت
ہو رہا تھا۔ یوسف اگر جھوٹوں بھی صالح کو اپنے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔ تو وہ بڑی خوشی
سے اجازت دے دیتا تھا۔ جب بھی وہ یوسف کے ہاں جاتا تھا۔ تو ابراہیم اس
سے کرید کرید کر زید کے حالات اور خیر و عافیت دریافت کیا کرتا تھا۔ اور بالکل
یہی کیفیت خود زید کی بھی تھی۔ وہ صالح سے ابراہیم کے حالات ہمدردی اور تعلق
خاطر کے ساتھ دریافت کیا کرتا تھا۔

زید کی بیوی نے بارہا اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے شوہر کو
کئی بار نادم کیا۔ اور اصرار کیا کہ وہ ابراہیم سے تعلقات استوار کر لے۔ لیکن اس کا
جواب ایک آہ سرد کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اول تو وہ اس موضوع گفتگو کو حتی الامکان
ٹال جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی اگر یہ باتیں چھڑ جاتی تھیں تو وہ چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا
تھا۔ نہ مداخلت کرتا تھا۔ نہ اعتراض، نہ سوال جواب، اور جب گفتگو ختم ہو جاتی
تھی تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا تھا اور اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

زید کے اس تلخ رویے نے ابراہیم کی شرافت اور سیادت پر ذرا بھی اثر
نہیں کیا تھا۔ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ کئی روز سے زید بیمار ہے۔ اور بیماری کی

شدّت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے تو وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور عیادت کے لیے پہنچ گیا۔ زید واقعی بہت بیمار تھا۔ بے حد کمزور ہو گیا تھا، تھوڑی تھوڑی دیر سے غشی کے دورے پڑتے تھے۔ جب ہوش میں آ جاتا تھا تو پھر باتیں کرنے لگتا تھا۔ اس کی قوتِ ارادی بے ہوشی کے دوروں کو تو نہیں روک سکتی تھی لیکن ہوش میں آنے کے بعد وہ اس پر غالب آنے کی کامیاب کوشش کرتا تھا۔ جب ابراہیم اس کے دروازے پر پہنچا تو سب سے پہلے سعید سے مڈبھیڑ ہوئی سعید نے اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔ لیکن ابراہیم نے خندہ پیشانی کے ساتھ اُسے سلام کیا اور پھر بڑی ملاطفت کے ساتھ دریافت کیا۔

"میں نے سُنا ہے عم محترم کی کچھ طبیعت ناساز ہے"۔

سعید نے مُنہ بنا کر جواب دیا۔

"ہاں ـــــ وہ کئی دن سے بیمار ہیں"۔

ابراہیم :۔ خدانخواستہ کوئی خطرناک مرض تو نہیں ؟

سعید :۔ خدا بہتر جانتا ہے۔

ابراہیم :۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔

سعید :۔ ناممکن ـــــــ وہ بیمار ہیں۔ اور کوئی ان سے نہیں مل سکتا طبیب نے منع کیا ہے۔

ابراہیم :۔ میں اُن سے باتیں نہیں کروں گا۔

سعید :۔ تو کیا صرف صورت دیکھئے گا ؟

ابراہیم :۔ اُنھیں ایک نظر دیکھ کر واپس چلا جاؤں گا۔

سعید :- میں معافی چاہتا ہوں۔

ابراہیم :- کیا تم مجھے چچا جان کے پاس نہیں جانے دو گے؟

سعید :- ہرگز نہیں۔

ابراہیم :- آخر کیوں؟

سعید :- وہ آپ سے خفا ہیں۔ آپ کی صورت سے بیزار ہیں۔ اس حالت میں آپ کے اور اُن کے آمنے سامنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ اُنھیں چڑانا چاہتے ہیں۔ اُن کا مذاق اُڑانا چاہتے ہیں۔ وہ میرے آقا ہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

ابراہیم :- (برہمی کے عالم میں) سعید! اب تک میں تمھیں معاف کرتا رہا۔ لیکن اب تم میرے ہاتھ سے پٹ جاؤ گے۔

سعید بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے والا تھا۔ کہ اتنے میں دروازے کا پٹ کھلا۔ اور زید کی بیوی نمودار ہوئی۔ اُسے دیکھ کر ابراہیم نے ادب کے ساتھ سر جھکا لیا۔ سعید بھی خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔

"دیکھ لیجئے چچی جان میں اتنا غیر ہو گیا کہ اب اس کی بھی اجازت ——— "

آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور گلوگیر ہو گیا۔ اور رونے لگا۔

زید کی بیوی نے قہر آلود نگاہوں سے سعید کو دیکھا اور کہا۔

"تمھاری شرارتیں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں مجھے صرف تمھاری شریف بیوی کا خیال روکتا ہے۔ ورنہ تم ایک دن بھی یہاں نہ ٹک پاتے ——— ہٹو راستے سے ابراہیم کو اندر آنے دو"

سعید ہٹ گیا۔

اور ابراہیم اپنی چچی کے ساتھ زید کے کمرے میں پہنچا

زید پر غشی کا دورہ پڑا تھا لیکن اب وہ ہوش میں آچکا تھا۔ اس کے حواس درست تھے۔ اُس نے ابراہیم کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

ابراہیم نے اس کو سلام کیا۔ اس کی آنکھیں اب تک نم آلود تھیں۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن زبان یارا نہ دیتی تھی۔

کچھ دیر تک ابراہیم خاموش بیٹھا رہا۔ اس اثنا میں زید پر پھر بے ہوشی کا ایک دورہ پڑا۔ ابراہیم بے تابی کے ساتھ اُس کی تیمارداری میں مصروف و منہمک ہو گیا تھوڑی دیر کے بعد جب پھر زید کو ہوش آیا تو وہ اُس کے چہرے پر سے اپنی نظریں نہ اُٹھا سکا۔

ابراہیم نے اُس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اُس نے بڑی التجا کے لہجے میں کہا۔

"چچا جان معاف کر دیجئے۔ میں اقرار کرتا ہوں، میں خاطی اور مجرم ہوں از خود خطا و از بزرگان عطا ——— آخر آپ کب تک مجھ سے خفا رہیں گے؟"

اب زید کے ضبط کا بند بھی ٹوٹا۔ اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے اُس نے شفقت کے ساتھ ابراہیم کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور کمزور آواز میں کہا۔

"میرے بیٹے، میرے بچے ——!"

عین اُسی وقت سعید کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا جل ہی

رہ گیا۔ اُلٹے پاؤں واپس گیا۔

ابراہیم نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا۔

"چچا جان جب تک آپ بیمار ہیں میں یہیں رہوں گا ——— آپ کی تیمارداری میرا فرض ہے۔"

زید نے مُنہ سے کچھ جواب نہ دیا۔ پر محبت سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

---

(۱۴)

وصیّت

تقریباً سوا مہینے تک زید زندگی اور موت کی کش مکش میں گرفتار رہا اور اس تمام عرصہ میں ابراہیم بڑی دل سوزی اور ہمدردی سے زید کی تیمارداری میں لگا رہا۔ اُس نے دن رات ایک کر دیئے تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے گھر نہیں گیا۔ صالح کو بھی اُس نے بلا لیا۔ اور اُس سے بھی تیمارداری کے چھوٹے موٹے کام لیتا رہا۔

زید ابراہیم کی اس محبت کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس سے بہت متاثر تھا۔

ایک روز زید نے ابراہیم کو پکارا۔

وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ابھی ابھی صبح کے جھٹپٹے میں ذرا آنکھ لگی تھی۔ ویسے بھی وہ زیادہ گہری نیند نہیں سوتا تھا۔ اور اس نے زید کی علالت کے باعث از

کے ہاں آمد و رفت اختیار کی تھی ، بہت چوکنا سوتا تھا ۔ آواز سنتے ہی وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اس نے کہا ۔

"چچا جان آپ نے پکارا تھا ۔ ؟"

زید :۔ ہاں بیٹا میں نے آواز دی تھی ـــــ تمھاری نیند خراب ہوئی لیکن میں مجبور تھا ۔

ابراہیم :۔ خدا کے لیے چچا جان ایسی باتیں نہ کیجئے ـــــ فرمایئے ، کیوں پکارا تھا آپ نے مجھے !

زید :۔ آؤ ، میرے قریب بیٹھ جاؤ ۔

ابراہیم اُس کے قریب آکر بیٹھ گیا ۔ زید نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا ۔ سب سے پہلے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں ۔"

ابراہیم :۔ مجھے شرمندہ نہ کیجئے ، خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے ، معافی کا ہے کی ، آپ کی خطا ہی کیا تھی ؟ خطاوار میں تھا ۔ اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ۔

زید :۔ یہ تمھاری سعادت مندی ہے بیٹے ، بعض اوقات ایسے ہوتے اور سعید نے کچھ ایسی درانداز یاں کیں کہ میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ۔

ابراہیم :۔ ٹھیک ہے چچا جان ۔ لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل ـــــ آپ کی طبیعت ویسے ہی خراب ہے ، خدا آپ کو صحت عطا فرمائے ۔ پھر اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں گی ۔

زید :۔ صحت ـــــ ناممکن ۔ ناممکن ۔

ابراہیم :۔ چچا جان

زید :۔ ہاں بیٹے ـــــ میں غلط نہیں کہتا

ابراہیم :۔ طبیب کہتا تھا انشاء اللہ چند روز میں آپ بالکل اچھے ہو جائیں گے

زید :۔ چند روز میں ـــــ بیٹے اب چند لمحوں میں میرا فیصلہ ہوا جاتا ہے۔
صرف چند لمحوں میں ـــــ

ابراہیم رونے لگا۔

"ایسا نہ کہیئے چچا جان"۔

زید :۔ بیٹے وقت نہ ضائع کرو۔ میں اب مر رہا ہوں۔ چند لمحوں سے زیادہ کا
میری سُن لو۔

ابراہیم :۔ (روتے ہوئے) فرمایئے۔

زید :۔ سعید کو اور یوسف کو اور اُس کی ماں کو بھی بُلا لو۔

ابراہیم نے سب کو اسی وقت جمع کر لیا۔

جب سب آ گئے تو زید نے کمزور اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا وقت پورا ہو چکا۔ میں اب اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں"۔

یہ سُن کر یوسف رونے لگا۔ اُس کی ماں چھاڑیں کھانے لگی۔ اور سعید
اور واویلا کرنا شروع کر دیا۔

ابراہیم نے بڑی مشکل سے سب کو خاموش کیا۔ پھر زید نے کہا۔

"دنیا میں ہر کوئی مرتا ہے۔ میں بھی مر رہا ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں"۔

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا

میں جانتا ہوں، کتنی وفاداری سے تم نے میرے گھر میں زندگی بسر کی مجھے یقین ہے میرے بعد بھی تمھاری وفاداری میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

زید کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"یوسف کا خیال رکھنا۔ ہم دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ میری یادگار ہے۔ اس کی تربیت اور تعلیم سے غفلت نہ برتنا۔"

پھر وہ یوسف سے مخاطب ہوا۔

"بیٹے سب کے باپ ہمیشہ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے۔ تم کیوں رو رہے ہو؟ تم عورت نہیں، مرد ہو۔ حوصلے سے کام لو۔ تمھیں زندہ رہنا ہے۔ کام کرنا ہے۔ اپنی زندگی بنانا ہے ——— دیکھو اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ اسے اگر کبھی کسی طرح کی بھی تکلیف ہوئی۔ تو میری روح کو اذیت پہنچے گی۔"

ایک کونے میں صالح کھڑا تھا — مغموم، افسردہ، مضمحل۔

زید نے صالح کی طرف دیکھا۔ پھر یوسف سے کہا۔

"اسے میں تم سے کم عزیز نہیں سمجھتا۔ بیٹا صالح! مجھے امید ہے تو بھی زندگی بھر یوسف کو اپنے بھائی کی طرح مانتا رہے گا۔"

وہ شدّت جذبات سے بے قابو ہو گیا۔ اُس نے روتے روتے کہا۔

میں یوسف کو بھائی سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو اس کے لیے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔

زید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں میرے بچّے مجھے یقین ہے تو سچ کہتا ہے۔"

پھر وہ ابراہیم سے مخاطب ہوا۔
"تم سے میں اپنی غلط کاری کی معافی مانگ چکا ہوں۔ مجھے امید ہے صدقِ دل
سے تم نے میری لغزش معاف کردی ہوگی"۔
ابراہیم نے زید کے قدموں پر سر رکھ دیا۔
"چچا جان مجھے شرمندہ نہ کیجئے"۔
زید نے محبت و شفقت کے ساتھ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔
میرے بچے صبر کر۔ اگر تو نے ہمت ہار دی تو اس گھر کے مغموم لوگوں کو کون سہارا
دے گا؟۔ ۔ہاں میں کیا کہہ رہا تھا —— یاد آیا —— سعید کو بھی معاف
کر دو بیٹے۔ تمہاری عالی ظرفی سے مجھے اُمید ہے ——"
ابراہیم:۔ میں نے صدق دل سے معاف کر دیا چچا جان"۔
زید:۔ شاباش —— جزاک اللہ
ابراہیم:۔ آپ زیادہ باتیں نہ کیجئے، کمزوری اور بڑھ جائے گی۔
زید:۔ میں اب بہت جلد ہمیشہ کے لئے خاموش ہونے والا ہوں —— ابراہیم
اور اس کی ماں کا خیال رکھنا۔ ان دونوں کو میں تمہاری سرپرستی میں دیتا ہوں
میرے کاروبار کی نگرانی بھی تمہارے ذمہ ہوگی —— اور اگر سعید کر سکے
تو اسے بھی گوارا کرنا۔ بہر حال وہ اس قابل ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔
ابراہیم:۔ چچا جان آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی —— سعید کو میں اپنے
اور دوست کی طرح رکھوں گا۔
زید:۔ سعید —— ابراہیم سے معافی مانگو —— اُس کی عالی ظرفی دیکھو

سعید اُٹھ کر ابراہیم کے قدموں پر گر پڑا۔ ابراہیم نے اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

پچھلی باتیں فراموش کر دو۔ میں بھی اُنھیں بھلا دوں گا۔"

زید:۔ اب میں خوش ہوا۔ اب میری رُوح مطمئن ہوئی۔ اب سکون سے میرا دم نکلے گا مجھے قرآن سُناؤ۔

صالح بڑی اچھی قرات کرتا تھا۔ ابراہیم نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بڑھا اور سرہانے بیٹھ کر خوش الحانی سے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے لگا۔

کمرے پر اس وقت عجیب ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، واقعی موت نے اس گھر میں بسیرا لے لیا ہے۔

صالح کی قرات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ زید نے ایک ہچکی لی۔ اور اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ یہ بڑا دل دوز اور جگر فگار سانحہ تھا۔ سعید چیخ چیخ کر رونے لگا۔ یوسف اور صالح بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ سعید کی بیوی بھی موت سے تھوڑی دیر پہلے آگئی تھی۔ اس نے یوسف کی ماں کو کلیجے سے لگایا۔ اور رو رو کر اُسے تسلی دینے لگی۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اتنے بڑے غم کی تاب نہ لا سکی۔ انسان تھی پیالہ و ساغر نہیں تھی میں۔

(۱۵)

ابراہیم کی شفقت

زید کی وفات کے بعد ابراہیم اپنے بال بچوں کے ساتھ اسی گھر میں اُٹھ آیا۔ یوسف کی والدہ کی خواہش بھی تھی۔ اور اس خواہش کو ٹھکرانا اس کے بس سے باہر تھا۔

ابراہیم بڑا منتظم اور ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے زید کے کاروبار کو ہر طرح سے کنٹرول میں لے لیا۔ مصارف زیادہ سے زیادہ کم کیے۔ اور تغیر آمدنی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے سعید کی دل دہی اور حوصلہ افزائی میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ وہ اُس کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ اگر کبھی اُس سے کوئی نقصان رساں حرکت سرزد ہو جاتی تھی اسے بھی معاف کر دیتا تھا۔ اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا تھا اور مصاحبت کے بجائے اس سے باقاعدہ کام لینا شروع کر دیا تھا۔ بہت جلد سعید اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ اور تندہی کے ساتھ اپنے فرائض منصوبہ انجام دینے لگا۔

ابراہیم صالح سے کہیں زیادہ یوسف کو چاہتا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اگر اس کی پیشانی پر بل بھی آیا۔ تو اس کی تکلیف وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ لیکن اس غیر معمولی محبت اور تعلق خاطر کے باوجود اس کی نگہداشت اور نگرانی میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا۔ وہ اس اصول پر سختی سے عامل تھا کہ لڑکے کو راحت زیادہ سے زیادہ پہنچائی جائے۔ لیکن اس کی نگرانی اور احتساب سے ذرا بھی غفلت نہ برتی جائے۔ خود یوسف بھی ابراہیم کی بہت مانتا اور اسے چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا تھا۔ جس کے بارے میں اُسے شبہ بھی ہو کہ یہ ابراہیم کو ناگوار گزرے گی۔ پڑھنے کا بھی اُسے شوق تھا۔ جی لگا کر پڑھتا تھا۔ فرصت کے اوقات مطالعہ اور تفریح میں صرف کرتا تھا۔ لیکن مطالعہ میں صرف وہ کتابیں پیش نظر رکھتا تھا جن سے علمی اور ادبی معلومات میں اضافہ ہو۔ اور تفریح وغیرہ وہ انتخاب کی جا سکتی تھی جس سے صحت کو ترقی ہو۔ دل بہلے۔ لیکن لہو و لعب میں حصہ لینے کی خدا بھی اجازت نہیں تھی۔

صالح اور یوسف میں یوں تو مدرسے کے ابتدائی زمانہ ہی سے بڑی گہری دوستی تھی۔ لیکن ایک گھر میں منتقل ہونے کے بعد تو اُن کی دوستی اور زیادہ پائندہ اور مستحکم ہو گئی تھی۔

ابراہیم کے کئی لڑکے تھے۔ سب سے زیادہ وہ صالح کو چاہتا تھا اور یوسف کو ابراہیم سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ کسی بات پر دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ اور یوسف نے صالح سے بولنا چھوڑ دیا۔ صالح دل سے چاہتا تھا کہ اس کی یوسف سے صلح ہو جائے۔ اس نے کئی مرتبہ اسے مخاطب کیا۔ اس سے خود باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں میں خواہ مخواہ دخل

دینے لگا۔ لیکن یوسف نے گویا اس سے نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔

دو تین روز تک تو ابراہیم یہ کیفیت دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ایک خادم کو بُلایا۔ دونوں فوراً حاضر ہو گئے۔

ابراہیم نے صالح سے پوچھا

"کیا تم سے اور یوسف لڑائی ہو گئی ہے۔؟"

صالح :۔ لڑائی تو نہیں ہوئی۔

ابراہیم :۔ پھر کیا ہوا؟

صالح :۔ یہ خفا ہو گئے۔

ابراہیم :۔ کس بات پر؟ کیا کیا تھا تم نے؟

صالح :۔ مجھے اب تک نہیں معلوم مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

ابراہیم :۔ تم نے پوچھا تھا؟ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی؟

صالح :۔ جی ہاں۔ کی تھی۔

ابراہیم :۔ پھر تم ان سے معافی کیوں نہیں مانگ لیتے۔

صالح :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) لیکن یہ معاف کرنے پر تیار بھی تو ہوں۔

یوسف آگے بڑھا۔ اس نے صالح کو سینے سے لگایا اور کہا۔

"چچا جان! میں ان سے خفا نہیں تھا۔"

ابراہیم :۔ پھر کیا بات تھی؟

یوسف :۔ صرف ان کی دوستی کو آزما رہا تھا۔

یہ کہہ کر وہ مُسکرا دیا۔ اور بڑے فخر بھرے انداز میں اس نے صالح کی طرف

ابراہیم اس منظر سے بہت متاثر ہوا۔ اُس نے پوچھا۔

"پھر یہ تمہارے تماں میں کامیاب اترا؟"

یوسف :۔ بہت زیادہ چچا جان ——— ہم دونوں کی دوستی کچا دھاگا نہیں، آہن اور فولاد ہے۔ جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔

ابراہیم :۔ انشاء اللہ ——— میری دلی تمنا یہی ہے کہ تم دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے سچے دوست بنے رہو۔

یوسف :۔ ہماری دوستی میں کبھی زوال نہیں آسکتا ——— آپ تو یونہی خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔

ابراہیم :۔ نہیں بیٹے خواہ مخواہ نہیں ——— مجھے واقعی اس کی بڑی فکر تھی۔ اگر اس وقت یہ ثابت ہو جاتا کہ صالح کی خطا ہے تو میں اُسے سرزنش کرتا۔ میں کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ میری اولاد سے تمہیں کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔

یوسف :۔ چچا جان ایک وعدہ کیجئے

ابراہیم :۔ کیا چاہتے ہو تم؟

یوسف :۔ اس واقعہ کا علم اماں جان کو نہ ہونے پائے۔ ورنہ انہیں بہت رنج ہوگا۔

ابراہیم :۔ کیا مطلب ——— یعنی انہیں خبر نہیں ہے؟

یوسف :۔ بالکل نہیں ——— اُن کے سامنے ان چند دنوں میں ایسا موقع ہی میں نے نہیں آنے دیا۔ جس سے انہیں اندازہ ہوتا کہ ہم دونوں میں بات چیت نہیں ہے۔

ابراہیم نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"بڑے شریر ہو تم ! تم نے تو مجھے بھی مغالطہ میں ڈال دیا تھا
وعدہ کرو اب تو ایسا نہیں کرو گے۔!"

یوسف :۔ آپ اطمینان رکھئے ہم دونوں میں نہ کسی قسم کی لڑائی تھی، نہ ہے، نہ ہو سکتی ہے۔

ابراہیم :۔ یہی میں بھی چاہتا ہوں۔

---

(۱۶)

عشق و محبت

دن اسی طرح گزرتے رہے ——— ! یوسف اور صالح کی دوستی پروان چڑھتی رہی ۔

جو لوگ اس خاندان کے دوست تھے وہ اس یگانگت پر رشک کرتے تھے جو مخالف اور رقیب تھے ، وہ جلتے اور کڑھتے تھے ۔

اور یہ دونوں دوسروں کے رشک و رقابت سے بے نیاز اطمینان اور آسودگی کے ساتھ زندگی کی منزلیں طے کر رہے تھے ۔

ایک روز یہ دونوں ابراہیم سے اجازت لے کر شکار کو گئے ۔ خوب جی بھر کے شکار کیا ۔ واپسی میں دونوں میں باتیں چھڑ گئیں ——— وہی باتیں جو محض وقت گزاری کے لیے بغیر کسی موضوع کے چھڑ جایا کرتی ہیں ۔

صالح نے کہا۔

"سُنا ہے تمھاری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ——!"

یوسف مُسکرا دیا

"ہاں سُنا تو میں نے بھی ہے۔"

صالح :۔ صرف سُنا ہے، جانتے نہیں کچھ ۔ ؟

یوسف :۔ بخدا اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ والدہ اپنی ہمشیرہ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔

صالح :۔ ٹھیک ہے۔ بڑا اچھا رشتہ ہے —— تم نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا بھی ہے ۔ ؟

یوسف :۔ کبھی نہیں ۔

صالح :۔ پھر کرو گے شادی ایک ایسی لڑکی سے جسے نہ تم نے کبھی دیکھا نہ اُس کے عادات و اطوار سے واقفیت حاصل کی۔

یوسف :۔ کرنی ہی پڑے گی۔

صالح :۔ اچھی زبردستی ہے ۔ یعنی یہ مجبوری ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی —— انکار کر دو۔

یوسف :۔ انکار کر دوں ؟

صالح :۔ ہاں اور کیا ؟

یوسف :۔ جانتے ہو میرے انکار کا انجام کیا ہوگا ؟

صالح :۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یوسف :- والدہ کا دل پھٹ جائے گا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور چچا جان میری صورت سے نفرت کرنے لگیں گے۔ اور بھیا مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ان دونوں حادثات میں سے کسی ایک کو برداشت کر سکوں۔ مجھے اپنی ماں سے بھی بڑی محبت ہے اور چچا جان سے بھی ——— وہ تمہیں اتنا نہیں چاہتے جتنا مجھے چاہتے ہیں۔

صالح :- ہاں جانتا ہوں۔

یوسف :- (چھیڑتے ہوئے) صرف جانتے ہو؟ جلتے نہیں کیوں جی ؟

صالح :- ضرور جلتا۔ اگر میں خود تمہیں اُن سے بھی زیادہ نہ چاہتا ہوتا سچ کہتا ہوں یوسف مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔

یوسف :- جانتا ہوں دوست مجھے فخر ہے تیری دوستی پر۔ ایسے دوست دنیا میں ملتے کیسے ہیں۔ جیسا خدا نے صالح کی صورت میں مجھے عطا کر دیا ہے۔

صالح :- اب گئے شاعری کرنے۔ چھوڑو یہ باتیں۔ کچھ اور باتیں کرو، جن سے راستہ کٹے۔

یوسف :- اچھا کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔ بتاؤ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟

صالح :- ہو جائے گی کبھی نہ کبھی۔ سُنا نہیں ہے تم نے وہ شعر ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یوسف :- جناب شاعری سے یہ مسئلہ حل نہیں ہونے کا۔ صاف صاف جواب دیجئے۔ میرے سوال کا۔ ورنہ پھر میں سب کچھ انکشافات شروع کر دوں گا۔

صالح :- اوہو ـــــ آپ انکشافات شروع کردیں گے۔

یوسف :- جی جناب۔

صالح :- بسم اللہ ـــــ فرمایئے کیا ارشاد ہوتا ہے؟

یوسف :- کہیئے، اُن کا ہماری ہونے والی بھابی سلمیٰ کا کیا حال ہے؟

یہ کہہ کر یوسف زور سے ہنسا۔

صالح نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہی انکشاف ہے حضور والا کا ـــــ؟

یوسف :- ہاں کچھ غلط تو نہیں؟

صالح :- میں کب غلط کہتا ہوں۔ مجھے تو اقرار ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔

یوسف :- اور وہ ـــ؟

صالح :- وہ مجھے چاہتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گہری اور سچی محبت کرتے ہیں۔ اور

یوسف :- زندگی کی آخری سانس تک کرتے رہیں گے ـــــ کیوں سچ ہے؟

صالح :- ہاں کچھ شک ہے تمہیں؟

یوسف :- شک کیوں ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو تو شادی کے رشتے میں منسلک کیوں نہیں ہو جاتے؟

صالح :- خدا کو منظور ہے تو وہ وقت بھی آجائے گا۔

یوسف :- کب ـــــ؟ جب بوڑھے ہو جاؤ گے۔؟

صالح ہنس پڑا۔

"بڑھاپے کی منزل ابھی بہت دُور ہے"۔

یوسف:۔ پھر بھی کوشش وسعی تو شروع ہو جانی چاہیے۔

صالح:۔ بات یہ ہے کہ سلمٰی کے والد اور میرے والد میں ان بن ہے کچھ اس لیے ڈر لگتا ہے سعی وکوشش کا آغاز کرتے ہوئے۔

یوسف:۔ کیوں اَن بن کیوں ہے ——؟

صالح:۔ کچھ خاندانی رقابتیں —— کچھ ذاتی رنجشیں۔

یوسف:۔ یہ سب باتیں تو شادی کے بعد دُور ہو جائیں گی۔ ان کا کیا اندیشہ۔

صالح:۔ مشکل —— ! یہ تو سچ ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اس طرح نہیں سوچتے۔ جس طرح ہم سوچتے ہیں۔

یوسف:۔ ہاں بھائی۔ یہ واقعی بہت بڑی مشکل ہے —— پھر اس کا کچھ حل تو سوچو۔

صالح:۔ وہی تو سمجھ میں نہیں آتا

یوسف:۔ اور اگر میں سوچ لوں تو کیا انعام دو گے؟

صالح:۔ مُنہ مانگا انعام —— بتاؤ نا۔ کیا بات آئی ہے۔ تمہارے ذہن میں؟

یوسف:۔ نہیں جی ابھی نہیں، پہلے مُنہ میٹھا کرو۔

صالح نے جیب سے نکال کر ایک خرمہ یوسف کی طرف بڑھایا اور کہا "لیجیے نوش جان کر لیجئے جلدی سے"۔

یوسف نے بے تکلفی کے ساتھ خرمہ لے لیا اور کھالیا۔

صالح :۔ اب بتاؤ خدا کے بندے ـــــ!

یوسف :۔ واہ ـــــ ایک خرمے سے کیا ہوتا ہے؟

صالح :۔ پھر کیا پورا درخت اُکھاڑ کر پیش خدمت کر دوں ـــ؟

یوسف :۔ ہاں ـــــ وہ بھی کم از کم ایک درجن ـــــ

صالح :۔ خدا کے لئے پریشان نہ کرو ـــــ سلمیٰ میری رُوح اور زندگی ہے۔ وہ اگر مجھے نہ ملی تو میں زندہ نہ رہوں گا۔ مرجاؤں گا۔ خودکشی کر لوں گا زہر کھالوں گا۔

یہ باتیں کچھ ایسے سوز و گداز اور تاثر کے لہجہ میں صالح نے کہیں کہ یوسف بے حد متاثر ہوا۔ اُس نے صالح کو گلے سے لگالیا۔ اور کہا۔

"ارے تم تو مرنے کے قریب ہو ـــــ!"

صالح :۔ ہاں یوسف تم میری کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

یوسف :۔ میں نے جان لیا، تم سلمیٰ سے محبّت کرتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے وہ تمہیں ملے گی۔

صالح :۔ تمہارے یقین سے کیا ہوتا ہے ـــــ مجھے بھی تو یقین دلاؤ۔

یوسف :۔ ارے بھئی ہم نے ایسی تدبیر سوچی ہے کہ

صالح :۔ خدا کے لئے بتاؤ وہ کون سی تدبیر ہے؟

یوسف :۔ وہ ایسی تدبیر ہے کہ خود چچا جان سلمیٰ کے گھر جائیں۔ اسکے اب

کو منائیں اور اُسے بیاہ کر لائیں ۔ اور —— اور ——

صالح :۔ تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو —— اباجان وہاں جائیں —— یہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔

یوسف :۔ کیسے نہیں ہو سکتا ۔ ضرور ہو گا —— !

صالح :۔ وہ بڑے ضدی ہیں ۔ کسی کی نہیں سنتے ۔

یوسف :۔ لاکھ ضدی ہوں ۔ لیکن یہ بات سننا پڑے گی ۔ ماننا پڑے گی ۔ ہاتھی سے گنّا کھانا آسان نہیں ۔

صالح :۔ تو ظالم کیوں ترسا رہا ہے ۔ خدا را بتا دے اپنی وہ ترکیب —— !

یوسف :۔ اچھا تو گوشِ ہوش سے سنو ۔ !

صالح :۔ سن رہا ہوں ۔

یوسف :۔ یُوں نہیں ۔ گوشِ ہوش سے سننے کو کہا تھا میں نے — !

صالح :۔ ارے بھئی گوشِ ہوش سے سن رہا ہوں ۔

یوسف :۔ تو وہ ترکیب یہ ہے کہ امّاں جان کو بیچ میں ڈالو ۔ انہوں نے اگر چچا جان سے سفارش کر دی تو وہ ہرگز انکار نہیں کر سکیں گے ۔ جانتے ہو تمہیں کتنا مانتے ہیں وہ —— ؟

یہ سُن کر صالح اچھل پڑا ۔ اُس نے کہا ۔

"ہاں بڑی عمدہ ترکیب ہے —— ان کا کہنا واقعی ابا جان کسی قیمت پر نہیں ٹال سکتے —— !

یوسف :۔ تو بس مان لو ۔ ہمیں اُستاد آج سے —— کہ کیسی عمدہ ترکیب بتائی

ہے۔ احسان تو نہ مانو گے؟

صالح :۔ احسان تو مانتا ہوں۔ لیکن ان سے کہے گا کون؟ میں تو نہیں کہہ سکتا

یوسف :۔ واہ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے ۔۔۔؟

صالح :۔ ہو یا نہ ہو۔ میری زبان تو ان کے سامنے کسی طرح نہیں کھل سکتی

یوسف :۔ اچھا پریشان نہ ہو، میں کہہ دوں گا۔ اور میرا کہنا وہ ضرور مان

صالح خوش ہو گیا۔

خلوص اور یگانگت

ظاہر ہے زید کو جتنی محبت یوسف سے ہو سکتی تھی، ابراہیم کو نہیں تھی - یقیناً وہ اس کے مقابلے میں صالح کو زیادہ چاہتا ہوگا کہ فطرت انسانی کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ دوسروں کی اولاد کے مقابلے میں اپنی اولاد کو زیادہ چاہتی ہے - ابراہیم بہرحال آدمی تھا۔ اور وہ ان کیفیات وجذبات سے بری نہیں تھا جو عام آدمیوں پر طاری ہوتے رہتے ہیں - لیکن چند باتیں ایسی تھیں کہ وہ اس میں بڑی شدت سے پائی جاتی تھیں - ان عادات وخصائل میں مشکل سے اس کا کوئی حریف اس کے ہم چشموں اور دوستوں میں ہوگا -

وہ یوسف کو اگرچہ زید سے زیادہ نہیں چاہتا تھا - لیکن اس کی غور و پرداخت کا اس کی تربیت اور نگہداشت، اس کی تعلیم اور صحت کا زید کے مقابلے میں بہت زیادہ خیال رکھتا تھا - وہ دنیا کے دوسرے کام بھی کرتا تھا - لیکن یہ کام بہت زیادہ چوکسی اور تندہی

سے انجام دیتا تھا۔ اس طرح وہ محبت چاہے صالح سے زیادہ کرتا ہو۔ لیکن یوسف ؑ
ماں صالح سے کہیں زیادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی فرمائشیں ٹال دیتا تھا۔ اس کی آرزو
اور حسرتوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس کے غم اور خوشی سے زیادہ متاثر نہیں ہو
تھا۔ لیکن یوسف کو ملول اور دل برداشتہ دیکھ لے یہ ناممکن تھا۔ کوئی موقع ہو، کوئی بات
ہو، وہ یوسف کی خوشی کو ہر چیز پر مقدم رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ صالح نے باپ سے گھوڑا خریدنے کی فرمائش کی۔ ابراہیم نے جواب
"ابھی نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا ۔۔ !"

یہ آواز ابھی فضا میں گونج ہی رہی تھی کہ یوسف آیا۔ اس نے بھی بالکل وہی فرمائش کی
ابراہیم نے بسر وچشم اس کی خواہش پوری کر دی۔ یوسف خوش خوش چلا گیا۔ صالح پر افسردگی
سی طاری ہو گئی۔ اس کی ماں ام کلثوم یہ بات برداشت نہ کر سکی۔ اس نے شکایت کے
لہجے میں شوہر سے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے یوسف تمہارا سگا بیٹا ہے، اور صالح سوتیلا۔ میری سمجھ میں نہیں
آتا تم ایسا برتاؤ اس سے کیوں کرتے ہو؟"

ابراہیم مسکرایا۔ اس نے بڑی استمالت کے ساتھ بیوی سے کہا۔

"تم ہم باپ بیٹوں میں رنجش ڈلوانا چاہتی ہو۔ لیکن یاد رکھو ایسا نہیں ہوگا۔ صالح بڑا سمجھ
بیٹا ہے۔ وہ تمہاری لگائی بجھائی میں نہیں آئے گا۔"

صالح کا غم دور ہو گیا۔ باپ کے یہ الفاظ سن کر وہ بھی مسکرانے لگا۔ پھر ابراہیم صالح
سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بیٹے میں غلط تو نہیں کہتا۔ ؟"

صالح :- کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے ابّا جان ـــــ کہ یہ خادم آپ سے خفا ہو ـ !

ابراہیم :- کیوں اُم کلثوم - یہ جواب سُن کر تم جل تو بہت ہوگی ؟

اُم کلثوم :- ہاں بہت زیادہ - میں نہ جلوں گی تو کون جلے گا ؟

ابراہیم :- دیکھو خفا نہ ہو ـــــ بات یہ ہے کہ اوّل تو صالح اور یوسف میں دوستی بہت گہری ہے -

اُم کلثوم :- تو اس سے کیا ہوتا ہے ؟

ابراہیم :- اس سے یہ ہوتا ہے کہ اگر میں اِس وقت یوسف کی بات رد کر دیتا تو جانتی ہو کیا ہوتا ؟

اُم کلثوم :- میں کیا جانوں -

ابراہیم :- صالح کو بڑی کوفت ہوتی ـــــ دونوں بہت محبت کرتے ہیں - ایک دوسرے سے ـــــ اور سچی دوستی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آدمی دوست کے لئے ایثار کرے -

اُم کلثوم :- اور سچی بات کا کیا تقاضہ ہے ؟

ابراہیم :- میں نہیں سمجھا اس سوال سے تمہارا مقصد کیا ہے ؟

اُم کلثوم :- بڑے بھولے -

ابراہیم :- سچ کہتا ہوں ـــــ بتاؤ کیا پوچھنا چاہتی ہو ؟

اُم کلثوم :- سچی محبت پدری کا تقاضہ کیا یہ نہیں کہ بیٹے کی دل دہی کی جائے - اس کی بات سُنی جائے ، یا اُسے خوش رکھا جائے -

ابراہیم :- کون انکار کرتا ہے اس بات سے - !

ام کلثوم :- تم اور کون؟ بہت دنوں سے تمہارا یہی رویہ صالح کے ساتھ دیکھ رہی ہوں۔ وہ نیک لڑکا ہے۔ پی جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ محسوس ہی نہیں کرتا۔ اُسے صدمہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا دل بھی نہیں کڑھتا ـــــ واہ آخر تم نے میرے بچے کو سمجھ کیا رکھا ہے۔

ابراہیم :- اپنا لختِ جگر ـــــ

ام کلثوم :- بڑا لختِ جگر ـــــ خالی الفاظ ہی الفاظ۔

ابراہیم :- اچھا بیٹے صالح! ایمانداری اور سچائی کے ساتھ تم اپنی حالت بتاؤ۔ میرے اس رویّے سے تمہیں کتنی تکلیف پہنچی؟

صالح چُپ رہا۔ ابراہیم نے پھر پوچھا۔

"دل کی بات سچ سچ کہہ دو۔ بخدا بُرا نہیں مانوں گا"

صالح :- آپ نے جب میری بات رد کی تو مجھے صدمہ ہوا۔

اُم کلثوم :- سُن لیا؟

ابراہیم :- ہاں ـــــ اچھا بیٹے کچھ اور بھی تو کہہ رہے تھے تم؟

صالح :- اور جب وہی بات یوسف کی ماں نے کی تو وہ صدمہ کافور ہوگیا۔ کیونکہ واقعی مجھے اس کی خوشی سے بہت خوشی ہوتی ہے۔

ابراہیم :- گویا مانتے ہو ـــ اور میں نے یوسف کی بات رکھ کر تمہیں خوش کیا؟

صالح :- جی ہاں۔ مانتا ہوں۔

ابراہیم :- (بیوی سے مخاطب ہوکر) اب فرمائیے ـــــ آخر وہ میرا بیٹا ہے نا؟

اُم کلثوم :- ہاں اور کیا ـــــ میں تو اس کی کچھ ہوں ہی نہیں -

ابراہیم :- یہ لو ـــــ بھئی ان کا غصہ تو اُترتا ہی نہیں کسی طرح -

اُم کلثوم :- رہنے بھی دو - دل بھی بہلاؤ اور دل بھی خوش رکھو - دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں -

اتنے میں یوسف آگیا - اُسے دیکھ کر اُم کلثوم خاموش ہو گئی -

ابراہیم :- کیوں بیٹا - اب کس طرح آنا ہوا ـــــ کوئی خاص بات ہے ؟

یوسف :- جی چچا جان - آپ سے ایک شکایت کرنے حاضر ہوا ہوں -

ابراہیم :- کس کی شکایت ؟

یوسف :- خود آپ کی ـــ !

ابراہیم :- میری شکایت ـــ ! اور مجھی سے ؟

یوسف :- آپ کے سوا اور کون ہے جس سے دل کی بات کہوں -

ابراہیم :- ہاں کوئی بات نہیں ، کہو کیا کہہ رہے تھے ؟

یوسف :- میں نے ابھی آپ سے جو فرمائش کی تھی وہ آپ نے پوری کر دی - اور وہی فرمائش صالح پہلے ہی کر چکا تھا مگر آپ نے انکار کر دیا -

ابراہیم :- ہاں واقعہ تو یہی ہے - لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہوا ؟

یوسف :- کل جب صالح نے آپ سے گفتگو کی تھی تو آپ کا کارندہ جمیل موجود تھا - آج جب میں اس سے روپے لینے گیا تھا اس نے مجھے بتایا -

ابراہیم :- اوہ ـــــ

اُم کلثوم :- کل ہی نہیں - صالح کی فرمائش آج ہی رد کی جا چکی ہے ـــــ ابھی

تھوڑی دیر کا واقعہ ہے ۔

یوسف :۔ چچاجان اس واقعہ سے مجھے بہت تکلیف ہوئی ۔

ابراہیم :۔ نہیں ۔ اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے ۔ کل پرسوں موقع محل دیکھ کر صالح بھی اپنی مرضی کا گھوڑا لے آئے گا ۔

یوسف :۔ تو چچا جان میں بھی جب ہی لاؤں گا ۔

ابراہیم :۔ یہ کیوں ؟

یوسف :۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ نخاس میں جا کر گھوڑے پسند کئے ۔ میں اپنی پسند کا لے آؤں اور وہ منہ دیکھتا رہ جائے ——— سچ پوچھئے تو مجھے شہسواری کا اتنا شوق نہیں ہے جتنا صالح کو ہے ——— میں تو محض اس کی ریس میں لاچار ہو گیا تھا ۔

ابراہیم :۔ یہ بات ہے ؟ ——— افسوس اب آج تو کسی طرح انتظام ہو ہی نہیں سکتا ۔ ورنہ ضرور صالح کو بھی روپے دلوا دیتا ۔ پھر کل سہی ۔

یوسف :۔ تو کل مجھے دے دیجئے گا ۔

ابراہیم :۔ نہیں ۔ تم اپنا دل نہ مارو ۔

اُم کلثوم :۔ ہاں بیٹا ۔ تم آج لے آؤ ۔ صالح کل لے آئے گا ——— ایک دن میں کیا بنا بگڑا جاتا ہے ——— شاباش !

ابراہیم :۔ تم نے جمیل سے روپے لے لئے ؟

یوسف :۔ جی ہاں لے لئے ۔

ابراہیم :۔ پھر گھوڑا کیوں نہیں لائے ؟ وہ تو لے آؤ ۔ باتیں پھر ہوتی رہیں گی ۔

یوسف :۔ لے تو آیا چچا جان۔

ابراہیم :۔ بہت اچھا کیا۔

یوسف :۔ لیکن چچا جان وہ میرا نہیں، صالح کا گھوڑا ہے۔ میں تو جب کل آپ مجھے دیں گے تب لاؤں گا۔

یہ سن کر صالح ضبط نہ کر سکا۔ اس نے یوسف کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا۔

"بھلا اس حماقت کی کیا ضرورت تھی؟"

یوسف :۔ کیوں نہیں تھی۔ بھلا ایسا ہو سکتا تھا کہ اپنا لے آتا اور تمہیں محروم و مغموم دیکھنا گوارا کر لیتا۔

صالح، یوسف کے اس ایثار سے خوش تو بہت ہوا، لیکن اس نے یوسف کو دوستانہ لہجے میں جھڑکتے ہوئے کہا۔

"احمق کہیں کے!"

یوسف نے جواب دیا۔

"ہاں بھئی ٹھیک کہتے ہو ——— سچ پوچھو تو دوستی حماقت کا دوسرا نام ہے!"

دونوں دوست ہنسنے لگے۔ یوسف نے کہا۔

"چلو گھوڑا دیکھ تو لو چل کر ——— اصطبل میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ گھوڑا نہیں کوئی بادشاہ ہے ——— وہی وقار ——— وہی دبدبہ ——— وہی رعب ———"

صالح ہنسنے لگا۔

"اب آپ آ گئے اپنے اصلی رنگ پر؟ ——— کسی وقت تو شرارت سے باز رہا کرو!"

یوسف :- یہ اُسی دن ہوگا جس دن میں زندہ نہیں رہوں گا ۔ صرف موت ہی میری زندہ دلی اور خوش طبعی کو ختم کر سکتی ہے ۔

اُدھر یوسف اور صالح کے باہر جانے کے بعد ام کلثوم نے ندامت کے لہجہ میں شوہر سے کہا۔

"واقعی دونوں بڑے سچے دوست ہیں "

ابراہیم :- اور میری دُعا ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک دونوں کی دوستی اور یگانگت قائم رہے ۔

بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ ام کلثوم نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ۔

"آمین ——— !!"

(۱۸)

عشقِ صالح

یوسف نے عشقِ صالح کی ایسی عفیف و دل گداز تصویر ماں کے سامنے کھینچی کہ سکینہ اس پر راضی ہوگئی کہ ابراہیم سے سلمیٰ کے بارے میں کہے گی لیکن یوسف اس وعدہ پر قانع نہ ہوا۔ ماں سے ضد کرنے لگا کہ نیک کام میں دیر نہیں کرتے۔ سکینہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"آخر تو اتنی جلدی کیوں کر رہا ہے؟ ——— تیری بات سُن لی۔ کہہ دوں گی کبھی موقع محل دیکھ کر۔"

یوسف :۔ موقع محل دیکھتے تو نہ جانے کتنی مدت لگ جائے ———

سکینہ :۔ تو کون سی قیامت آ جائے گی آخر ——؟

یوسف :۔ اماں جان مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تاخیر سے مایوس اور بد دل ہو کر وہ

اپنی جان کے پیچھے نہ پڑ جائے ——— بڑا ضدی ہے۔

سکینہ:۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے ایسی حماقت کا ارادہ بھی کیا تو واقعی پھر اُسے سلمیٰ کبھی نہیں ملے گی۔

یوسف:۔ یہ کیوں اماں جان؟

سکینہ:۔ اس لئے کہ وہ اگر ضدی ہے تو ابراہیم بھی کچھ کم ضدی نہیں ہے۔ وہ اپنے بیٹے کا باپ ہے۔ اگر چڑ گیا تو میرے کہنے کو بھی ٹال جائے گا" بڑی بے بسی کے ساتھ یوسف نے کہا۔

"آہ ———! پھر کیا ہوگا؟"

سکینہ:۔ لیکن اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ یا وعدہ تو کرتی ہوں کسی نہ کسی طرح ابراہیم کو راضی کر لوں گی۔

یوسف:۔ اور اگر وہ نہ مانے ———؟

سکینہ:۔ (ہنس کر) شادی نہیں ہوگی پھر ———

یوسف:۔ نہیں نہیں۔ یہ نہ کہیئے ——— میں صالح کی ناکامی نہیں دیکھ سکتا۔

سکینہ:۔ میں بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے کہ جانتی ہوں، صالح کی محبت پاک ہے۔ وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح غصیلا اور بد فطرت نہیں ہے۔

یوسف:۔ ہاں وہ بہت نیک اور مضبوط کردار کا آدمی ہے۔

سکینہ:۔ اور سلمیٰ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ اس کی ماں سے میری شناسائی ہے۔ جب بھی میں وہاں گئی یا کسی دوسری جگہ ملنا ہوا۔ یا یہاں وہ ماں بیٹی آئیں، تو انہیں میں نے سراپا اخلاق و شرافت پایا۔

یوسف خاموشی سے بیٹھا ماں کی باتیں سُن رہا تھا کہ اُس نے کہا۔

"اگر میں پہلے سے تیری شادی اپنی بہن کی لڑکی سے نہ طے کر چکی ہوتی تو ضرور سلمٰی کو پیام تیرے لئے دیتی ؟"

یوسف :- خیر ــــــ آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا ــــــ باقی سلمٰی سے میں کس طرح شادی کر سکتا تھا ــــــ ؟ صالح جس لڑکی سے محبت کرے میں اُس سے شادی کروں ــــــ ناممکن ــ قطعاً ناممکن ـ

سکینہ :- کچھ دیوانہ ہُوا ہے لڑکے ــــــ میں تو ایک بات کہہ رہی تھی، اور مجھے تو یہ بات آج معلوم ہوئی ہے کہ صالح اور سلمٰی میں محبت ہے ـ

یوسف :- تو ان دونوں محبت کرنے والوں کی مدد کیجئے ــــــ ثواب ہوگا اماں جان آپ کو ـ

سکینہ :- اب مجھے عذاب و ثواب کی بشارت تو نہ دے ــــــ وعدہ پر بھروسہ کر ــــــ آج کل ابراہیم کو بہت کچھ پریشان دیکھتی ہوں۔ شاید کاروبار میں کوئی خسارہ آگیا ہو ــــــ ایسے حالات میں اس طرح کی باتیں نہیں کی جاتیں ـ

یوسف :- اونہہ اماں جان! کاروبار میں نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے ـ لیکن اس کی وجہ سے زندگی کا کاروبار تو نہیں رُک جاتا ــــــ وہ تو ہر حالت میں جاری رہتا ہے ــ

سکینہ :- اچھا دیکھ تو مجھ سے زیادہ باتیں نہ کر ـ

یوسف :- میں ابھی چلا جاؤں گا بس آپ بھی میرے سامنے اُٹھ کر ابراہیم چچا کے

پاس چلی جائیے۔

سکینہ :۔ (سمجھاتے ہوئے) کہہ چکی ابھی مناسب نہیں ہے۔ یہ اہم معاملہ ہے ۔۔۔ اس
میں بچوں کی طرح ضد مناسب نہیں ۔۔۔ چند ماہ بعد صالح کی سالگرہ ہوگی
اُس وقت میں اس مسئلے کو چھیڑوں گی۔ اور اُمید ہے کہ ابراہیم ضرور مان
جائیں گے ۔۔۔

بات معقول تھی۔ یوسف کی سمجھ میں آگئی۔ اُس نے کہا۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے ۔۔۔ جاتا ہوں صالح کو مطمئن کردوں"

پھر وہ ماں کے پاس سے اُٹھ کر صالح کے پاس آیا۔ وہ اپنے کمرے میں اس
طرح ملول و افسردہ بیٹھا تھا۔ اور سلمیٰ ہی کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا۔ کوشش تو
لیکن یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی ۔۔۔ کہ اتنے میں یوسف آگیا۔ اس
آؤ دیکھا نہ تاؤ، صالح کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی ۔۔۔ وہ چونک پڑا۔

"کیا ہوا بھائی ۔۔۔؟"

یوسف :۔ تمہارے لئے ایک بڑی اچھی خوشخبری لایا ہوں"

صالح :۔ سمجھ گیا ۔۔۔ تم نے سلمیٰ کے بارے میں ۔۔۔

یوسف :۔ ہاں، میں نے اماں جان کو راضی کر لیا ۔۔۔ وہ چچا جان کو را
لیں گی ۔۔۔

۔۔۔ کہو خوش ہوئے۔

صالح :۔ اِس سے بڑھ کر خوشخبری واقعی میرے لئے کوئی نہیں ہوسکتی
یہ تو بتاؤ ابا جان نے جواب کیا دیا ؟

یوسف نے کہا۔

واقعی کچھ دیوانے ہو گئے ہو۔۔۔ میں نے کب کہا کہ ان سے بات چیت ہو گئی۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اماں جان کو میں نے تمہارا ہمدرد بنا دیا۔ وہ راضی ہو گئیں کہ چچا جان سے بات چیت کر کے انہیں قائل کر سکیں گی۔ اس لیے کہ وہ ان کی بات کسی طرح نہیں ٹالتے۔ اور حضرت دریافت فرماتے ہیں کہ ابا جان رضامند ہو گئے؟

صالح نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

یہ تو بہت دنوں سے سن رہا ہوں۔ خالی خولی باتوں سے نہ شب ہجر کٹ سکتی ہے نہ دل بے قرار کو تسکین مل سکتی ہے۔ نہ آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو سکتی ہیں۔۔۔ جاؤ واپس جاؤ مجھے خوش خبری سنانے اس وقت آنا۔ جب ابا جان نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔۔۔!

یوسف:۔ تم ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو۔ اور یہ ناممکن ہے۔

صالح:۔ میں محبت کرتا ہوں۔ اور محبت کرنے والوں کے لیے ہر بات ناممکن ہی ہوا کرتی ہے۔

یوسف:۔ یہ کیا بکنے لگے

صالح:۔ ہاں بھئی غلط نہیں کہتا۔ اگر ان کے لیے کامیابی کے دروازے بند نہ ہوں تاکامی کا قصر وسیع آغوش کشادہ ہو۔ تو پھر ان کا شمار محروم القسمت میں کیوں ہو۔

یوسف:۔ پھر وہی بہکی بہکی بے سروپا باتیں۔!

صالح :۔ جو چاہو کہہ لو ـــــــ نہ سنو میری باتیں !

یوسف :۔ اس وقت تم بہت متاثر نظر آ رہے ہو۔

صالح :۔ ہاں ، بہت زیادہ ـــــــ ناکامی کا بھیانک دیو جس کے سامنے منہ کھولے کھڑا ہو ، اگر وہ متاثر اور عمل تنظر نہ آئے تو کیا تم نظر آؤ گے ؟

یوسف :۔ آخر ناکامی کی دہشت اس قدر کیوں طاری کر لی ہے تم نے اپنے اوپر بیٹھ جاؤ ۔

صالح :۔ اس لیے کہ میں ناممکن بات کا طالب ہوں ۔

یوسف :۔ دنیا میں ہزاروں آدمی عاشق ہوتے ہیں ۔ چند کے سوا سب ہی کامیاب و بامراد ہوتے ہیں ۔

صالح :۔ لیکن میرا شمار اُن چند لوگوں میں ہے ۔ جو کامیاب و بامراد نہیں ہوتے

یوسف :۔ یہ کیسے جانا تم نے ۔؟

صالح :۔ اس طرح کہ میری وجہ سے دنیا کا انتظام نہیں بدل سکتا ۔ لوگوں کے دل نہیں بدل سکتے ۔ سوسائٹی کے اصول نہیں بدل سکتے ـــــــ پھر کس بنا پر میں اُمید و آرزو کی دنیا بساؤں ۔ بتاؤ ؟

یوسف :۔ لیکن ساری اَن ہونی باتیں تم نے ممکن کیوں فرض کر لی ہیں ۔!

صالح :۔ بتاؤ کیا میرے والد اپنی آن توڑ کر سلمیٰ کے باپ سے صلح کریں گے ؟ ـــــــ پھر کیا سلمیٰ کا باپ پُرانی دشمنی بھول اُنھیں دوست بنا لے گا ۔ ان پر اعتماد کرے گا ؟ اور مجھے اپنا داماد بنانے پر رضامند ہو جائے گا یہ باتیں ناممکن ہیں ۔

یوسف :۔ واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے جو ایسی باتیں کر رہے ہو۔!

صالح :۔ یہی سمجھ لو۔

یوسف :۔ لیکن ان باتوں کا انجام جانتے ہو کیا ہوگا؟

صالح :۔ نہیں جانتا۔ نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

یوسف :۔ اس طرح تم صرف اپنی جان نہیں کھوؤ گے، اپنے ساتھ اور بھی کئی لوگوں کا خون کرو گے۔

صالح :۔ (بے دلی کے ساتھ) چھوڑو دیکھنے یہ باتیں ہمارے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال پر بحث کرنا ہی بیکار ہے۔

یوسف :۔ یہ بتاؤ تمہاری سالگرہ میں اب کتنے دن باقی ہیں؟

صالح :۔ اس سوال سے مطلب

یوسف :۔ یہ پھر بتاؤں گا پہلے میرے سوال کا جواب دو۔

صالح :۔ چند مہینے باقی رہیں گے۔

یوسف :۔ کیا تم سالگرہ تک میرے قول کی صداقت کا امتحان نہیں کر سکتے۔

صالح :۔ کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ سالگرہ کا کیا معمہ ہے۔ یہ تو سمجھاؤ پہلے۔

پھر یوسف نے اپنی اور سکینہ کی ساری باتیں دوہرا دیں۔ اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

کیا اب بھی تمہیں اعتبار نہیں آیا؟

اور قبل اس کے کہ صالح کوئی جواب دے، یوسف نے اور زیادہ تاکید و وثوق کے ساتھ کہا۔

"اگر سالگرہ کے موقع پر بھی میں اپنے قول کی سچائی نہ ثابت کر سکا تو خود ہی زہر لاکر تمھیں دوں گا ــــ اطمینان سے خودکشی کر لینا ـــــ بتاؤ اپنی سالگرہ تک تو کسی قسم کی حرکت نہیں کروگے؟"

صالح:- نہیں، لیکن سوچ لو تم نے بہت بڑا وعدہ کیا ہے۔

یوسف:- ہاں سوچ لیا۔ میں نے بہت بڑا وعدہ کیا ہے۔ اور اس وعدہ کے تمام نتائج سے بھی پورے طور پر واقف ہوں۔

---

(۱۹)

سلمیٰ

سلمیٰ بڑی نیک اور شائستہ لڑکی تھی۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ایک عرب دوشیزہ میں ہوتی ہیں۔ وہ بڑی سلیقہ شعار تھی اور خانہ داری سے واقف تھی۔ اگرچہ ایک دولت مند گھرانے کی فرد تھی۔ لیکن گھر کے کام بڑی حد تک خود انجام دیتی تھی۔ حُسن اخلاق کا جوہر بھی اس کے پاس تھا، جس کسی سے ملتی اپنے اخلاق کا ایک نقش قائم کر دیتی اس کے دل پر۔ ہنس مکھ اور خلیق بھی بہت تھی۔ رحم دلی اُس کی فطرت تھی۔ ناممکن تھا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھے اور بے قرار نہ ہو جائے۔ سب کے کام آنا، سب سے ہمدردی کرنا اُس کا شیوہ تھا۔

سلمیٰ کا باپ جمال بھی ایک شریف اور دیندار شخص تھا۔ تجارت ذریعۂ معاش

تھا۔ اور اس کاروبار میں اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی - یوں تو اس کی کئی لڑکیاں اور لڑکے تھے ۔ لیکن وہ سلمٰی کو بہت مانتا تھا ۔ اس کی سیرت اور کردار کی وہ دل سے قدر کرتا تھا ۔

جمال اور ابراہیم پُرانے دوست تھے ۔ ابراہیم جب مروین منتقل ہوا تھا ۔ اس وقت بھی جمال سے اُس کی شناسائی تھی ۔ ٹھہرتا وہ بالعموم زیدی کے ہاں تھا لیکن جمال کے ہاں اس کی دو ایک پُر تکلف دعوتیں ضرور ہوتیں تھیں - اور چونکہ صالح اکثر باپ کے ساتھ رہتا تھا ۔ وہ نہ صرف ان دعوتوں میں بلکہ ویسے بھی ہر تقریب میں شریک رہتا تھا ۔ جمال کے گھر والے اس کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ کرتے تھے ۔ نہ کوئی مغائرت تھی ، نہ حجاب ۔

رفتہ رفتہ صالح اور سلمٰی میں پینگ بڑھنے لگی ۔ تعلق خاطر کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب دونوں بالکل نوعمر اور کم سن تھے ۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ لگاؤ بھی بڑھتا گیا ۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے ۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ دونوں میں کون ایک دوسرے کو زیادہ چاہتا تھا ؟

صالح اور سلمٰی کی یہ یگانگت بجائے اس کے کہ گھر والوں کو کھٹکتی ، ان کی خوشی کی موجب تھی ۔ جمال اور اُس کی بیوی دل ہی دل میں یہ سوچتے تھے کہ صالح سے اچھا داماد اور کون ملے گا ۔ اور ابراہیم اور اس کی بیوی کا خیال تھا سلمٰی سے اچھی بہو ملنا ناممکن ہے ۔

یہی وجہ تھی کہ ذرا بھی مزاحمت نہیں ہوئی ۔ دونوں میں پینگ بڑھتے رہے ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ پیمانِ محبت کی تجدید پر تجدید ہوتی رہی ۔ صالح کہا کرتا تھا ۔

"سلمیٰ! تم مجھے بہت پسند ہو۔ سوچتا ہوں: تمہارے بغیر اگر مجھے زندہ رہنا پڑا
س طرح زندہ رہوں گا ——!
اور سلمیٰ مسکرا کر جواب دیتی۔
زہر کھا لیجئے گا ——!
وہ کہتا۔
"ہاں —— اگر خدانخواستہ تم نہ رہیں تو بے شک زہر کھا لوں گا۔ ایسی زندگی
ے نہیں چاہیے جو سلمیٰ کے بغیر ہو۔"
وہ صالح کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور کہتی۔
"بس بس، زیادہ باتیں نہ کیجئے —— آخر اس طرح کے خیالات آپ کے
یں آتے ہی کیوں ہیں؟
صالح جواب دیتا۔
"لاکھ روکتا ہوں کہ نہ آئیں، مگر بن بلائے مہمان کی طرح آجاتے ہیں۔ آخر کس
ح روکوں ——؟"
سلمیٰ مسکرا کر بڑے زور سے کہتی۔
"تو ایسے وقت میرے پاس چلے آیا کیجئے۔"
صالح پوچھتا۔
"پھر کیا ہوگا؟"
وہ جواب دیتی۔
"یہاں آکر دل بہل جایا کرے گا۔ اطمینان خاطر بڑی چیز ہے۔"

پھر کچھ سوچتے سوچتے صالح دریافت کرتا۔

اور اگر کبھی تم خفا ہوگئیں، روٹھ گئیں مجھ سے۔ تب کیا کروں گا؟ کس کے پاس جاؤں گا۔

وہ جواب دیتی۔

پھر آگئے، آپ اپنے رنگ میں ——— آخر میں آپ سے خفا کیوں ہونے لگی کسی اور سے بھی نہیں، آپ سے ——— ! عقل کے ناخن لیجئے۔

صالح:۔ بھئی یہ ناممکن ہے؟ ——— تم مجھ سے خفا نہیں ہو سکتیں۔

سلمٰی:۔ کبھی نہیں ——— محبت کرنے والا دل خفا نہیں ہوتا کبھی۔

صالح:۔ پھر کیا کرتا ہے؟

سلمٰی:۔ اگر خفگی کی کوئی بات بھی ہوگی تو اس کی تاویل کر لیتا ہے۔ اور مطمئن ہو جاتا ہے ——— اگر آپ کی طرف سے کبھی کوئی بات ہوئی بھی تو میں سو طرح تاویل کر لوں گی۔

جوشِ محبت سے صالح بے خود ہو گیا۔

"سلمٰی! تم کتنی اچھی ہو ——— !!

سلمٰی:۔ بتائیے کتنی اچھی ہوں ———؟

صالح:۔ کن الفاظ میں بتاؤں؟ کیسے بتاؤں؟ بس یہ سمجھ لو بہت اچھی ——— سب سے زیادہ ——— سب سے زیادہ ——— !

سلمٰی:۔ بس کیجئے ——— کسی کے منہ پر اُس کی تعریف نہیں کیا کرتے۔ پھر" مغرور ہو جاتا ہے۔

صالح :- کیا اپنے بارے میں بھی تمھیں اندیشہ ہے ؟

سلمیٰ :- ہاں، کیوں نہیں۔

صالح :- مغرور ہو کر بھی تم اچھی لگو گی ——— حُسن کسی حالت میں بُرا نہیں لگتا۔

سلمیٰ :- اب آپ نے بنانا شروع کر دیا ——!

صالح :- نہیں سلمیٰ، میں بناتا نہیں، دل کی بات کہتا ہوں۔

سلمیٰ :- (مسکرا کر) بہت بہت شکریہ، آپ کی اس قدر افزائی کا ——!

صالح :- اب تم بنانے لگیں ؟

سلمیٰ :- (مسکرا کر) نہیں ——— یہ بات نہیں ——— اچھا ایک بات پوچھوں۔ بتائیے گا ——؟

صالح :- کیوں نہیں بتاؤں گا۔ بھلا تم سے کوئی بات چھپا سکتا ہوں۔

سلمیٰ :- اگر خود آپ خفا ہو گئے۔ تو میں کیا کہوں گی ؟

صالح :- میں ؟ ——— میں !

سلمیٰ :- ہاں آپ، ——— کیوں کیا یہ نہیں ہو سکتا ؟ ——— دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔

صالح :- میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔ لیکن اگر کوئی بات ناممکن ہے تو میرا تم سے خفا ہونا ——— بھلا کوئی اپنے سے خفا ہوتا ہے۔

سلمیٰ :- توبہ کیجیے، توبہ ——— اب تو آپ کفر بکنے لگے۔

صالح :- نہیں، کافر نہیں ہوں، مسلمان ہوں، اور اپنے اسلام پر فخر کرتا ہوں۔

تمھاری پوجا خدا سمجھ کر نہیں کرتا۔

سلمیٰ :۔ پھر کیا سمجھ کر کرتے ہیں ؟

صالح :۔ کرشمۂ خداوندی ـــــ کرشمۂ خداوندی دیکھ کر بھی کبھی کبھی پوجا کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

سلمیٰ :۔ اچھا ہوگا۔ چھوڑیئے یہ رام کہانی

صالح :۔ پھر کیا کہوں ؟

سلمیٰ :۔ کچھ اور باتیں کیجیے۔

صالح :۔ روٹھ گئیں میری باتوں سے

سلمیٰ :۔ نہ آپ سے روٹھ سکتی ہوں۔ نہ آپ کی باتوں سے اپنا ذکر بدلنا چاہتی ہوں ـــــ آپ میرا ہی ذکر تو کر رہے تھے۔

صالح :۔ ہاں ـــــ اور یہی ذکر میری زندگی کا ماحصل ہے ـــــ ! اس کے سوا بس کوئی ذکر اچھا نہیں لگتا !

سلمیٰ :۔ لیکن اپنے ساتھ دوسروں کی پسند کا خیال بھی تو کیا کیجیے۔ مجھے تو اچھا نہیں لگتا یہ ذکر ـــــ کیا آپ میرے جذبات کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں کریں گے !

صالح نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سلمیٰ نے اُس کی پُر آشوب آنکھیں دیکھ کر کہا۔

" ارے آپ تو خفا ہو گئے ـــــ ابھی کیا کہا تھا یاد ہے ـــــ کہا تھا میں کبھی تم سے خفا نہیں ہو سکتا۔

اور یہ کہتے کہتے خود سلمیٰ کی آنکھیں بھی آب گوں ہو گئیں۔
بڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے چپ چاپ بیٹھے
رہے۔ پھر سلمیٰ نے کہا۔

"اچھا معاف کر دیجئے۔ اب کبھی آپ کی روک ٹوک نہیں کروں گی۔"

بچوں کی طرح صالح خوش ہو گیا۔ جس طرح روتا ہوا بچہ سہم جاتی چیز پا کر ہنستا
تھا۔ اس نے کہا۔

مجھے یہی یقین تھا ——— میرا دل کہہ رہا تھا تم ہی کہو گی"!

سلمیٰ اٹھلاتی ہوئی نازو انداز کے ساتھ بولی

"کیا کہنا ہے آپ کے دل کا ——— اتنا بے ذوق اور بد مذاق دل میں نے
کسی کا نہیں دیکھا"

صالح:۔ یہ کیسے کہہ رہی ہو؟ میرے دل کو؟ ——— آخر کیا کیا اس غریب
نے؟

سلمیٰ:۔ جی اس کے حُسنِ انتخاب کی داد دے رہی ہوں ——— ایک میرا
دل ہے ——— !

صالح:۔ یعنی میرے دل کا انتخاب غلط ہے۔ اور تمہارے دل کا صحیح ———؟

سلمیٰ:۔ اور کیا ——— آپ نے ایک ایسی لڑکی کو پسند کیا ہے جس میں کوئی خوبی
نہیں ——— اور میں ایک ایسے
یہ کہتے کہتے وہ شرما گئی ——— صالح نے کہا۔

"کہو، کہو ——— اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟

وہ بولی۔

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر کہے سمجھ لی جاتی ہیں۔ بتائیے کہ کے میں ...
رہی تھی ؟"

صالح :۔ میں نہیں جانتا۔ صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ کسی بیوقوف اور کندہ نا...
کا ذکر کر رہی تھیں۔ اچھا ہوا تم خاموش ہو گئیں۔ میں اس کا نام بھی سننا نہ...
چاہتا ـــ اچھا سنو! اب میں جاتا ہوں، کل ہمارے ہاں چھوٹے بھائی کی...
ہے۔ والد نے تم سب کو بلایا ہے۔ اُمید ہے ضرور آؤ گی !

سلمیٰ :۔ ہاں آؤں گی۔ لیکن ایک شرط سے !ـــــ وہاں تاک جھانک ...
کیجئے گا۔ نہ مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش کیجئے گا ـــــ ابھی سے ک...
دیتی ہوں ـــ!

صالح :۔ سُن لیا ـــ!

سلمیٰ :۔ وعدہ کیجئے عمل بھی کریں گے۔

صالح :۔ اس کا وعدہ نہیں کروں گا۔

سلمیٰ :۔ تو میں نہیں آؤں گی۔

صالح :۔ اچھا تو وعدہ کرتا ہوں !

سلمیٰ :۔ نہیں۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔

صالح :۔ بالکل نہیں۔

سلمیٰ :۔ اچھا تو قسم کھائیے۔

صالح :۔ قسم کھاتا ہوں۔

پھر دونوں ہنسنے لگے۔

لیکن دوسرے روز سلمیٰ نہیں آئی۔

اور بیچارہ صالح دل پکڑ کر رہ گیا۔

جمال اور ابراہیم میں ایک بالکل معمولی بات پر ان بن ہو گئی تھی۔ اور بہت جلد اس ان بن نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ دونوں میں ملنا جلنا بند ہو گیا۔ بات چیت بند ہو گئی۔ دلوں میں غبار بیٹھ گیا۔ جمال نے ابراہیم سے سارے تعلقات منقطع کر لیے۔ اور ابراہیم نے جمال سے ترک تعلق کر لیا ——— اور اس ترک تعلق نے سلمیٰ اور صالح کے دل کی دنیا ویران کر دی۔

---

(۲۰)

ملاقات

محبت کرنے والے دل کسی بات سے متاثر نہیں ہوتے۔ وہ صرف محبت
کرنا جانتے ہیں دشمنی اور مخالفت کیا چیز ہے، یہ اُن کی بلا جانے۔

شدست سینہ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینہ اغیار در دلم جا نیست

انھیں اپنی محبت سے اتنی فرصت کب ملتی ہے کہ دوسروں کی نفرت
دشمنی سے سروکار رکھیں۔

بالکل یہی کیفیت صالح اور سلمیٰ کی تھی۔
ان دونوں کے والدین ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں
اور ان دونوں کا یہ حال تھا کہ جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیں زندگی بے

اور سوگوار نظر آتی تھی۔

صالح اور سلمیٰ کی محبت بڑی بے لوث تھی۔ اس میں نفس پرستی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ یہ دونوں گھنٹوں اور پہروں موقع پاکر تنہا بیٹھے رہتے تھے، باتیں کیا کرتے تھے۔ ہجر و فراق کی داستانیں سنایا کرتے تھے، لیکن مجال ہے کہ صالح نے کبھی سلمیٰ کو اس نظر سے دیکھا ہو۔ جس میں نفس چھک رہا ہو۔ سلمیٰ نے کوئی ایسی حرکت بھولے سے بھی کی ہو جو دعوت معصیت کی حیثیت ہو۔

سلمیٰ کی ماں، صالح کو بہت چاہتی تھی۔ چنانچہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں نہ صرف وہ صالح کو اپنے ہاں آنے دیتی تھی۔ بلکہ موقع دیتی تھی کہ یہ دونوں آپس میں ملیں اور تسکین قلب کا سامان مہیا کریں۔ لیکن ایسے موقع بہت کم آتے تھے۔

ایک مرتبہ بہت دنوں کے بعد صالح، سلمیٰ کے گھر پہنچا۔ اس کی ماں نے خیر مقدم کیا۔ اور محبت بھرے لہجہ میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

"بیٹے یہ بے بات کی لڑائی کبھی ختم بھی ہوگی؟"

صالح:۔ کیا بتاؤں۔ اس خواہ مخواہ کی جنگ سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض دفعہ تو ایسا جی چاہتا ہے کہ ——

پھر آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔

سلمیٰ کی ماں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم —— کیا جی چاہتا ہے؟"

صالح نے کہا۔

"یہ کہ اپنی زندگی ختم کر لوں۔ ایسی زندگی سے کیا حاصل جو مستقل کلفت کا سبب بن گئی ہو"

وہ کہنے لگی۔

"نہیں ایسی باتیں نہ کرو۔ تم ابھی بچے ہو۔ تم نے ابھی دُنیا کا دیکھا کیا ہے؟"

صالح :۔ جو کچھ دیکھ لیا ہے۔ اس کے بعد اب کچھ دیکھنے کی حسرت نہیں رہی"

وہ کہنے لگی۔

"تو کیوں نہیں کوشش کرتے کہ یہ تفرقہ مٹ جائے"

صالح :۔ کس طرح کروں۔ ہزار مرتبہ کوشش کی لیکن ابا جان بھی ایک ضدی ہیں۔

وہ مُسکرائی۔

"یہ ساری ضد اُس وقت تک ہے جب تک میرا سامنا نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھ لیا تو بھابی بھابی نہ کرنے لگیں تو اپنا نام بدل دوں۔ وہ تو میں خود منہ نہیں لگاتی تمہارے باپ کو ——"

صالح :۔ ہاں یہ تو صحیح ہے۔ آپ کو بہت مانتے ہیں۔ اب بھی جب کبھی ذکر آتا ہے، آپ کی تعریفیں ہی کرتے ہیں۔

وہ کہنے لگی۔

وہ تو کیا ہی چاہیں —— میں نے ہمیشہ انھیں اپنا بھائی سمجھا۔ اور وہی برتاؤ کیا جو بہن اپنے بھائی سے روا رکھتی ہے۔

صالح :۔ بے شک یہی بات ہے ـــــ لیکن پھر آپ نے کیوں چھوڑ دیا انھیں

وہ پھر مسکرانے لگی۔

نہیں ـــ میں نے چھوڑا نہیں ہے۔ صرف دیکھ رہی ہوں کسی دن جا کر ایسی خبر لوں گی کہ یاد ہی کریں گے۔

صالح :۔ "یا اللہ وہ مبارک دن کب آئے گا؟

اس نے پوچھا۔

"تو چاہتا ہے جلد آجائے؟"

صالح :۔ جی ـــــ میں چاہتا ہوں ابھی آجائے۔

وہ بولی۔

"اچھا۔ تو کل میں تیرے ہاں آؤں گی"

صالح :۔ (خوشی سے بے خود ہو کر) واقعی آپ آئیں گی؟

بڑی بی نے کہا۔

ہاں ضرور آؤں گی۔ لیکن خبردار گھر میں کسی سے ذکر نہ کرنا۔ ورنہ سارا لطف غارت ہو جائے گا۔

صالح :۔ نہیں ـــ ایسی حماقت ہرگز نہیں کروں گا۔

اتنے میں سلمیٰ اپنی ماں کو پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ صالح یہاں بیٹھا ہے۔ یوں یک بیک سامنا جو ہوا تو وہ گھبرا گئی اور اُلٹے پاؤں واپس جانے لگی۔ اس کی ماں نے اُسے بُلایا اور کہا۔

تو واپس کیوں جا رہی ہے۔ صالح بہرحال میرا بچہ ہے۔ جا اس کے لیے کوئی

چیز لا۔ کچھ نہ ہو تو کھجور اور دُودھ لے آ۔

سلمٰی یہ چیزیں لینے چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
کہاں رہ گئی سلمٰی"!

وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ سلمٰی آ گئی۔ ماں نے کہا۔

" تو یہاں بیٹھ، میں ابھی آئی۔"

سلمٰی نے دودھ اور کھجور سے صالح کی تواضع کی۔

صالح نے کہا۔

"واہ ری قسمت ——— !"

سلمٰی :۔ مجھے دیکھ کر آپ قسمت کا گلہ کرنے کیوں بیٹھ گئے ؟

صالح :۔ اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شہر میں ہیں، اور پھر انہیں مل سکتے۔

سلمٰی :۔ زیادہ ناشکری نہ کیجئے ——— جب چاہتے ہیں آتے ہیں، بیٹھتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔ مگر قسمت کا شکوہ بھی ہو رہا ہے۔

صالح :۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ چوری چھپے کا ملنا کب تک ؟

سلمٰی :۔ جب تک بڑے جنگ نہ ختم کر دیں گے۔

صالح :۔ اور بڑے جنگ ختم کریں گے انہیں کسی طرح

سلمٰی :۔ کریں گے !

صالح :۔ یہ تم نے کیسے جانا ؟

سلمٰی :۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ میں جا کر ابراہیم کو ایسا ڈانٹوں گی کہ معافی ہی مانگتے

بن پڑے گی اُسے ـــ! لیکن کہیں لڑائی اور نہ بڑھ جائے۔

صالح :۔ نہیں ـــــ اُسی دن ختم ہو جائے گی۔

سلمیٰ :۔ کیا معلوم؟

صالح :۔ میں جانتا ہوں۔

سلمیٰ :۔ کچھ بھی نہیں جانتے آپ۔

صالح :۔ سچ سلمیٰ ـــ! ابا جان چچی کو بہت مانتے ہیں۔

سلمیٰ :۔ یہ نہ کہیے، مانتے ہیں ـــــ یہ کہیے مانتے تھے۔

صالح :۔ اب بھی مانتے ہیں۔ تم دیکھ لینا، اُن کے جانے سے فضا بدل جاتی ہے ہمارے گھروں کی۔

سلمیٰ :۔ لیکن اماں کا وہاں جانا کچھ سنسنی کھیل تو ہے نہیں۔

صالح :۔ یہ کیوں؟

سلمیٰ :۔ وہ روہیں آکر ایک بات کہہ دیتی ہیں۔ پھر بھول بھی جاتی ہیں۔ کہ کب کہا تھا۔

صالح :۔ مجھ سے تو اُنھوں نے وعدہ کیا ہے کہ کل آئیں گی ہمارے گھر۔ اور مجھے یقین ہے وہ ضرور آئیں گی۔

سلمیٰ :۔ (خوش ہو کر) کل کا وعدہ کیا ہے ـــــ واقعی؟

صالح :۔ ہاں۔ بہت پختہ وعدہ۔

سلمیٰ :۔ تو پھر وہ جائیں گی۔

صالح :۔ اور پھر جانتی ہو کیا ہوگا؟

سلمٰی :۔ میں غیب کی باتیں نہیں جانتی ۔

صالح :۔ میں جانتا ہوں ——— بتاؤں ؟

سلمٰی :۔ (مسکرا کر) میں غیب کی باتیں بتلانے والوں کو بھی سچا نہیں سمجھتی ——!

صالح :۔ گویا ہم جھوٹے ہیں ؟

سلمٰی :۔ پھر کیا غیب دان ہیں ؟

صالح :۔ ہاں ہیں ——— سُنو، ہم کیا بتلاتے ہیں ۔

سلمٰی :۔ فرمائیے ۔

صالح :۔ پھر ہماری شادی ہوگی ——— یہ تفرقہ کا دور ختم ہوجائے گا ۔ شادمانی کا

شروع ہوگا ۔ اور ——— اور ———

سلمٰی :۔ اور کچھ نہیں ۔ پھر آپ کی آنکھ کھُل جائے گی ۔ اور آپ آنکھیں ملتے ہو

اُٹھ بیٹھیں گے ، پھر کہیں گے ۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا ۔

کیوں یہی بات ہے نا ——— ؟

صالح :۔ نہیں ——— ایسی منحوس باتیں نہ کرو ۔ میں خواب نہیں دیکھتا ۔ حقیقت

بیان کرتا ہوں ۔

سلمٰی :۔ اچھا جو کچھ آپ نے بیان کیا ، میں نے سُن لیا ۔ اب یہ افسانہ ختم کیجیے

آتی ہوں گی ۔

صالح :۔ تو وہ آکر خفا تو نہیں ہوں گی ہم پر ۔ ہماری باتوں میں مخل تو نہیں ہوں گی

جو تہ دل سے چاہتی ہیں کہ ہم دونوں ملیں ملتے رہیں ۔ اُن کی دلی تمنا ہے ۔ ہماری

ایسے رشتہ سے وابستہ ہو جاتے کہ پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جُدا نہ کر سکے

وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہیں جتنا ایک ماں اپنے بچے کو ——

سلمٰی :۔ اور آپ ؟

صالح :۔ میں بھی انھیں اتنا ہی چاہتا ہوں جتنا ایک سعادت مند لڑکا اپنی ماں کو

سلمٰی :۔ مجھے حیرت ہے، آپ کتنی تیزی سے اور کتنی کثرت سے باتیں کرنے لگے معلوم ہوتا ہے جیسے

صالح :۔ ہاں سلمٰی، تمھارے سامنے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

سلمٰی :۔ یہ کس لیے ؟

صالح :۔ تمھارے سامنے اگر جی چاہتا ہے کہ جو کچھ دل میں ہے وہ کہہ ڈالوں، کوئی بات نہ چھپاؤں، کوئی راز نہ رکھوں۔

سلمٰی :۔ پھر تو یہ اچھی بات ہے۔ لیکن آپ تو اِدھر اُدھر کی باتیں بھی بہت کرنے لگتے ہیں۔

صالح :۔ ہاں —— تاکہ تم بیٹھی رہو، جاؤ نہیں۔

سلمٰی :۔ آپ خاموش رہیں تو بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ کو چھوڑ کر چلی جاؤں —— میرا بھی تو یہی جی چاہا کرتا ہے !

صالح :۔ کیا —— ؟ کس بات کا جی چاہا کرتا ہے ؟

سلمٰی :۔ (شرما کر) چھوڑیئے بھی۔

صالح :۔ نہیں سلمٰی، تمھیں بتانا پڑے گا۔

سلمٰی :۔ نہیں بتاتے۔

صالح :- تو میں خفا ہو جاؤں گا ۔

سلمیٰ :- آپ اس دن عہد کر چکے ہیں ۔ کہ مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوں گے یاد ہے ؟

صالح :- ہاں یاد ہے ـــــ میں تم سے کبھی نہیں خفا ہو سکتا ۔

سلمیٰ :- پھر ابھی دھمکی کیوں دے رہے تھے ؟

صالح :- لیکن تم دھمکی میں آئیں کب ؟

اتنے میں سلمیٰ کی ماں آگئی ۔ اور دونوں خاموش ہو گئے ۔

---

(۲۱)

حُسنِ اتفاق

آج ابراہیم کے سب سے چھوٹے لڑکے اسمٰعیل کا عقیقہ تھا۔

سارے گھر میں مسرت کے شادیانے بج رہے تھے۔ ہر شخص جوشِ مسرت سے بے تاب ہو رہا تھا۔ ابراہیم کی بیوی ام کلثوم شاید اس لیے کہ اسمٰعیل سب سے چھوٹا تھا، اسے بہت زیادہ چاہتی تھی۔ اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ گھر کے سب لوگ تو اس تقریب میں جوش و خروش کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لے ہی رہے تھے۔ لیکن باہر سے بھی مہمانوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ابراہیم اور زید مرحوم کے دوستوں عزیزوں اور واقفین کی فوج کی فوج چلی آ رہی تھی۔

جب سب لوگ آ گئے تو سکینہ سے مخاطب ہو کر ابراہیم کو سُناتے ہوئے اُم کلثوم نے بڑے حسرت بھرے لہجہ میں کہا۔

سب آئے ، مگر وہ نہیں آئی خدیجہ ـــــــ سلمٰی کی ماں ـــــــ بڑی مسخری ہے
آج ایسی ایسی حرکتیں کرتی کہ سارے گھر کو ہنستے ہنستے لٹا دیتی۔

ابراہیم بولا۔

" ہاں، واقعی اگر خدیجہ بہن ہوتیں تو بڑا مزا رہتا۔

ام کلثوم :۔ ارے چلو ہٹو بھی۔ خود ہی تو خواہ مخواہ لڑ بیٹھے۔ اور اب بیٹھے افسوس کر رہے ہیں۔

ابراہیم :۔ لڑائی تو میری جمال سے ہے، خدیجہ بہن سے تو نہیں۔

سکینہ :۔ تو پھر بہن کا حق سمجھا ہوتا۔ خود گئے ہوتے، اسے لے آتے جاکر کون سی مہندی چھٹ جاتی پاؤں کی۔

اُم کلثوم :۔ خود نہیں گئے تھے، پیام بھیج دیا ہوتا۔ سچ کہتی ہوں سر کے بل آتی۔

ابراہیم :۔ کیسی نادانی کی باتیں کرتی ہو، خدیجہ کو بُلا لیتا۔ اور جمال کو نہ پوچھتا، بھلا یہ ممکن تھا۔

سکینہ :۔ جمال کو بھی بلا لیتے تو کون سا غضب ہو جاتا۔ کوئی وہ تمہارا دشمن تو ہے نہیں؟

ابراہیم :۔ میں کب کہتا ہوں وہ دشمن ہے ـــــــ البتہ بے وقوف ضرور ہے ـــــــ وہ بھی حد سے زیادہ۔

اُم کلثوم :۔ دنیا جہان کی عقل تو اللہ میاں نے تم ہی کو دے دی ہے۔

ابراہیم :۔ تم تو لڑنے لگیں !

اُم کلثوم :۔ کیسے نہ لڑوں، مجھے تو رونا آرہا ہے۔ ایسی تقریبیں روز روز تو ہوتی

نہیں۔ ایسے موقعوں پر بھی اگر دوستوں اور مخلصوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یاد کب کیا جائے گا۔

ابراہیم :۔ ایسی تقریبوں کے رفتہ بروز یعنی اکثر و بیشتر ہونے کا جہاں تک تعلق ہے، اس کی تو فکر نہ کرو۔

اُم کلثوم :۔ کیوں فکر نہ کروں۔

ابراہیم :۔ خدا ہمیں تمہیں سلامت رکھے، وہ تو ہوتی ہی رہیں گی

اُم کلثوم :۔ (شرما کر) اچھا بھی تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھا کرتا ہے۔ جاؤ ابھی خدیجہ اور جمال کو اپنے ساتھ جا کر لاؤ۔

ابراہیم :۔ میں نہیں جاتا۔

اُم کلثوم :۔ تو میں بھی جا کر کمرے میں لیٹی جاتی ہوں۔

ابراہیم :۔ یہ کیوں؟

اُم کلثوم :۔ کوئی حصہ نہیں ملے گی اس تقریب میں ——— واہ یہ بھی اچھی زبردستی ہے۔ جو یہ چاہیں وہ ہو۔ جو ہم چاہیں وہ بالکل نہ ہو۔

ابراہیم :۔ میں منع نہیں کرتا۔ ایسی ہی بے قرار ہو تو جاؤ بلا لاؤ جا کر۔

اُم کلثوم :۔ وہ آ جائے گی؟

ابراہیم :۔ کیوں نہیں آئے گی۔

سکینہ :۔ نہیں، وہ اپنے شوہر کی تو بھی نہیں برداشت کر سکتی کہ اُسے تو بلایا جائے۔ مگر جمال کو جھوٹوں بھی نہ پوچھا جائے۔

ابراہیم :۔ اچھا تو آپ کی رائے یہی ہے کہ میں جاؤں۔

سکینہ :- ہاں بھتیا۔ میری تو یہ خواہش ہے ——————— ضرور جانا چاہیے تمھیں ———

ابراہیم :- تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں کہہ دیا۔

ام کلثوم :- پہلے ہی کہہ دیا ہوتا تو کیا کر لیتے تم۔

ابراہیم :- فوراً چلا جاتا، آپ کا ارشاد تو میرے لیے حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتا ہے۔

ام کلثوم :- تو کیسے ہوئے دیر کون سی ہوئی ہے۔ اب چلے جاؤ ——!

ابراہیم :- ہاں، ابھی جاتا ہوں۔

سکینہ :- لیکن ایک شرط ہے۔

ابراہیم :- وہ شرط بھی فرما دیجئے۔

سکینہ :- اب کبھی تم دونوں میں تلخی نہ پیدا ہو۔ بلکہ اس مرتبہ جو دوستی کا پیمان بندھے وہ اتنا مضبوط ہو کہ وہ عمر بھر ٹوٹ نہ سکے۔

ابراہیم :- کوشش تو یہی ہوگی میری۔ آگے اللہ جانے۔

سکینہ :- اس کی ترکیب میں نے سوچ لی ہے۔

ابراہیم :- میں قائل ہوں کہ آپ جو کچھ سوچتی ہیں وہ بہت خوب ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت میں سمجھا نہیں کہ کس ترکیب کی طرف اشارہ ہے آپ کا ———؟

سکینہ :- (مسکرا کر) تم وہاں ہو آؤ، پھر بتا دوں گی۔

ابراہیم :- اس سے پہلے نہیں۔

سکینہ :- نہیں ـــــ ضد نہ کرو۔ جاؤ جلدی سے ۔

ابراہیم :- ابھی گیا۔

ابراہیم کو جاتا دیکھ کر سکینہ اور اُم کلثوم دونوں مُسکرانے لگیں ۔

ابراہیم کو گئے ہوئے مشکل سے دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ سکینہ نے اُم کلثوم سے کہا ۔

"دیکھنا جی ـــــ وہ خدیجہ آ رہی ہے نا؟"

اُم کلثوم :- ہاں ـــــ یہ اتنی جلدی کیسے آ گئی؟ ابھی تو وہ وہاں پہنچے بھی نہیں ہوں گے ۔

سکینہ ابھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی کہ خدیجہ بالکل قریب آ گئی سکینہ اور اُم کلثوم نے اُٹھ کر اُسے گلے سے لگا لیا ۔ پھر کہا ۔

اُم کلثوم :- یہ چاند کدھر سے نکل آیا؟

خدیجہ :- (مُسکرا کر) بادل کی اوٹ سے !

ام کلثوم :- لیکن کیسے؟

خدیجہ :- بے غیرت جو ہے ۔

اُم کلثوم :- ایسی باتیں نہ کرو ۔

خدیجہ :- تو یہ کہہ دوں کہ تم نے بُلایا ہے، اس لیے چلی آئی ـــــ حالانکہ بُلانا تو درکنار جھوٹ موٹ بھی نہیں پوچھا ۔

اُم کلثوم :- میں جو کچھ کہوں گی اس کا اعتبار تم کیوں کرنے لگیں؟ (سکینہ کی طرف اشارہ

کر کے) ان سے پوچھ لو۔ انھیں تو سچا مانتی ہو۔؟

خدیجہ:۔ انھیں ہیں کیا ساری دُنیا سچا مانتی ہے، لیکن تم خود کیوں نہیں کہتیں میرے نزدیک تو تم بھی بڑی سچی ہو —— کیوں چچی؟

سکینہ:۔ ہاں اور کیا!

اُم کلثوم:۔ نہیں۔ میں نہیں بتاتی۔ آپ ہی بتایئے۔

پھر سکینہ نے از اوّل تا آخر ساری داستان سُنا ڈالی۔ یہ کتھا سُن کر خدیجہ نے ام کلثوم کو گلے سے لگا لیا۔ اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

ہاں مجھے تم سے یہی اُمید تھی —— مردوں سے زیادہ عورتوں کی دوستی بے لاگ ہوتی ہے —— لیکن میرا خلوص بھی دیکھ لو کہ تقریب کی سُن گُن ملتے ہی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً چل پڑی۔ حالانکہ اُنھوں نے روکا بھی۔

سکینہ:۔ جمال نے؟

اُم کلثوم:۔ آنے دو، دیکھنا کیسی خبر لیتی ہوں —— وہ میری بہن کو روکنے والے کون ہوتے ہیں۔

خدیجہ:۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہیں۔ میرے اصرار کے باوجود نہیں آئے۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا آنے کا۔

سکینہ:۔ یہ کیسے جانا تم نے؟

خدیجہ:۔ (ایک پڑیا کی طرف اشارہ کر کے) یہ تحفہ دیا ہے اُنھوں نے بچے کو۔

سکینہ:۔ اچھا یہ بات ہے۔ تحفے تحائف بھی جاری ہیں اور لڑائی بھی۔

خدیجہ:۔ میں ان کی طرف داری نہیں کرتی، لیکن سچ کہتی ہوں، وہ ابراہیم بھائی کو بیٹے

بھائی سے زیادہ مانتے ہیں۔

اُم کلثوم :۔ ضرور مانتے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے۔

سکینہ :۔ ہاں، میں بھی جانتی ہوں، وہ بڑی مخلص اور بے ریا طبیعت کا آدمی ہے۔

ام کلثوم :۔ (مسکرا کر) لیکن یہ تو بتاؤ فرما کیا رہے تھے؟

خدیجہ :۔ کہہ رہے تھے بے بلائے جانا مناسب نہیں۔ کسی موقعہ پر صالح کے ہاتھ یہ تحفہ بھیج دینا اور آنکھیں پرنم تھیں۔

اُم کلثوم کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ پھر اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"لیکن انشاء آج ساری رنجشیں دور ہو جائیں گی"

خدیجہ :۔ ابراہیم بھائی ہیں کہاں؟ خدا انھیں بلاؤ تو، ایسی خبر لوں گی کہ یاد کریں گے وہ بھی، کسی سے پالا پڑا تھا۔

اُم کلثوم :۔ وہ تو گئے ——!

خدیجہ :۔ اس وقت؟ —— آئے کہاں؟

سکینہ :۔ تمہارے ہاں۔

خدیجہ :۔ رہنے بھی دیجئے۔

ام کلثوم :۔ دیکھئے، یہ خدیجہ اتنی تمیز ہے کہ آپ کی بات کا بھی اعتبار نہیں کرتی۔

خدیجہ :۔ توبہ —— تم نے تو بات کرنا مشکل کر دیا۔ میں پوچھ رہی ہوں ابراہیم

کچھ خبر ہے آج کون دن ہے؟

جمال: — ہاں جمعہ ہے۔

ابراہیم: — آج کی خصوصیت کیا ہے؟

جمال: — عیدالمومنین

ابراہیم: — اس کے علاوہ۔

جمال: — وہ میں نہیں جانتا۔

ابراہیم: — میرے بچے کا عقیقہ ہے۔

جمال: — مجھے معلوم ہے۔

ابراہیم: — پھر آئے کیوں نہیں؟

جمال: — میں خدیجہ کی طرح بے حیا اور بے غیرت نہیں ہوں۔

ابراہیم: — کیا کہا ——؟ خدیجہ بہن کو بے حیا اور بے غیرت کہہ رہے ہو ——!

جمال: — ہاں اس کو۔

ابراہیم: — بے غیرت اور بے حیا تم ہو — وہ میری بہن ہے۔ اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

جمال: — تو جاؤ، اس کی عزت افزائی کرو۔ جاکر خوب جی بھر کے ——!

ابراہیم: — ہاں میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

جمال: — وہ گئی بھی ——!

ابراہیم: — کہاں گئی ——؟ جھوٹ نہ بولو۔

جمال :- نہیں - میں جھوٹ نہیں بولتا ـــــــ وہ تمہارے ہاں گئی ہے
حالانکہ میں اُسے منع کر رہا تھا ۔

ابراہیم :- تم سے اُمید بھی یہی تھی ـــــــ لیکن واقعی خدیجہ بہن میرے ہاں
گئیں ـــــ ؟

جمال :- ہاں بھئی ہاں ۔ کتنی دفعہ پوچھو گے ؟ اور کتنی دفعہ میں جواب
دُوں گا ۔

ابراہیم :- ہاں - اُس نے بہن کا حق ادا کر دیا ۔

جمال :- تم بھی تو بھائی کا حق ادا کرنے آئے ہو ۔

ابراہیم :- بے شک ـــــ سلمیٰ کہاں ہے ؟

جمال :- وہ یہیں ہے ۔

ابراہیم :- وہ نہیں گئی خدیجہ کے ساتھ ۔

جمال :- نہیں ـــــ وہ آپ کی بہن ، میری بیٹی ہے

ابراہیم :- میری بچی ہے (بلند آواز سے) سلمیٰ !

ایک گوشہ سے سلمیٰ جی کہتی ہوئی برآمد ہوئی اور چُپ چاپ جا کر ادب سے ہاتھوں کے اشارے سے سلام کیا ۔ اور مودب ہو کر کھڑی ہو گئی ۔

ابراہیم نے اس پر ایک محبت بھری نظر ڈالی اور کہا ۔

" بیٹی ! میں تمہیں لینے آیا ہوں ـــ !

سلمیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ باپ کی طرف متفسرانہ نظروں سے دیکھنے

ابراہیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔

چل کس کی مجال ہے یہ میرے ساتھ جانے سے تجھے روک سکے۔

یہ کہہ کر اُس نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا۔ اور اُسے لے کر چلا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اُس نے چلتے چلتے کہا۔

"چلتی ہوں چچا جان، کپڑے تو بدل لوں۔

ابراہیم:۔ نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی چل۔

سلمیٰ:۔ بچوں کی طرح ہمک کر، نہیں، یوں جاتے مجھے شرم آتے گی۔ ابھی دو تین منٹ میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔

ابراہیم نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے پہنچی۔ اس اثنا میں جمال چپ چاپ بیٹھا رہا۔ نہ اُس نے کوئی بات کی، نہ جنبش کی، وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

ابراہیم نے کہا۔

"یوں کب تک بیٹھے رہو گے بندۂ خدا؟

جمال:۔ پھر کیا کروں؟

ابراہیم:۔ بتاؤں؟

جمال:۔ فرمایئے۔

ابراہیم:۔ میرے ساتھ چلو۔

جمال:۔ شکریہ۔

ابراہیم :۔ شکریہ کا شکریہ ——— بس اٹھو جلدی سے

جمال :۔ سلمیٰ اور خدیجہ میری نمائندگی کریں گی۔

ابراہیم :۔ میں اُن کی نمائندگی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

جمال :۔ تو تشریف لے جایئے۔

ابراہیم :۔ بغیر تمہارے ؟

جمال :۔ ظاہر ہے اور کیا صورت ہو سکتی ہے ۔!

ابراہیم :۔ دیکھو بھئی میرے صبر و ضبط کی حد ہو چکی ہے۔ اُٹھتے ہو یا پھر اٹھاؤں ؟

جمال :۔ کیا مطلب ؟

ابراہیم :۔ مطلب یہ کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

جمال :۔ آ گئے اپنے رنگ پر۔

ابراہیم :۔ ہاں ——— لیکن تم کب تک بے رنگ رہو گے ؟

جمال :۔ تم نے میرے دل کو بہت صدمہ پہنچایا ہے

ابراہیم :۔ مانتا ہوں۔ لیکن تمہارے دل کو صدمہ پہنچا کر خود اپنے دل کو بھی میں نے بہت صدمہ پہنچایا ہے ——— ایک دن بھی خوش نہیں رہا۔

جمال :۔ کیوں ——— ؟ میری یاد میں ؟

ابراہیم :۔ ہاں ——— تمہیں یقین نہیں آتا ؟

جمال :۔ بالکل نہیں۔

ابراہیم :۔ میں جھوٹا ہوں۔

جمال :۔ اوّل درجے کے۔

ابراہیم :۔ تمھیں میرے خلوص کا اعتبار نہیں ؟

جمال :۔ پہلے تھا ـــــ اب نہیں ـــ ذرا بھی نہیں

ابراہیم :۔ ـــ بے مروّت کہیں کے ـــــ

جمال :۔ تم سے کم

ابراہیم :۔ ـــ یار اب پچھلی باتیں بھول جاؤ ـــــ بخدا میں بہت شرمندہ ہوں۔

جمال :۔ لیکن ہر بات نہیں بھلائی جا سکتی۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ابراہیم :۔ آخر تم چاہتے کیا ہو ـــــ ؟

جمال :۔ کچھ نہیں۔

ابراہیم :۔ اگر کہو تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں ؟

اتنے میں سلمیٰ کپڑے بدل کر آ گئی۔ اس نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا۔

"چلئے چچا جان ـــ !"

ابراہیم :۔ آؤ بیٹی چلیں۔

سلمیٰ :۔ چلئے ـــــ ابا جان میں جا رہی ہوں۔

جمال :۔ ہاں بیٹی، تم شوق سے جا سکتی ہو۔

ابراہیم :۔ حضور والا زیادہ بنئے نہیں۔ آپ کو بھی شوق سے چلنا پڑے گا۔ "پھڑیا بدستے دگرے دست بدستے دگرے" والا معاملہ مجبوراً کر

پڑے گا۔

جمال :۔ اچھا تم چلو ـــ میں آجاؤں گا ـــ!

ابراہیم :۔ اللہ رے نخرے بازیاں ـــــ خدا کے بندے یہ باتیں کام نہیں دیں گی۔ تمھیں چلنا پڑے گا۔

سلمیٰ :۔ (معصومیت کے ساتھ) چلئے نا ابا جان ـــ!

جمال :۔ (حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھ کر) یہ تو کہہ رہی ہے؟

ابراہیم :۔ اور کیا میں کہہ رہا ہوں ـــــ اس معصوم کی بات بھی رد کروگے؟

جمال :۔ لیکن ایک شرط ہے۔

ابراہیم :۔ ایک نہیں، چند اور شرطیں منظور ـــ لیکن خدا کے لیے بس اب رخت سفر باندھو۔ بڑی دیر ہو رہی ہے ـــــ انتظار کر رہے ہوں گے

جمال :۔ وعدہ کرو، اب کبھی ایسا بیہودہ پن نہیں کروگے۔

ابراہیم :۔ صدق دل سے وعدہ کرتا ہوں۔

جمال :۔ معافی مانگو۔

ابراہیم :۔ معافی مانگتا ہوں۔

جمال :۔ (مسکرا کر) ناک رگڑو۔

ابراہیم :۔ ناک رگڑتا ہوں۔

جمال :۔ صرف زبان سے ـــ؟

ابراہیم :۔ نہیں ـــ زبان سے نہیں ہاتھ سے۔

جمال ہنس پڑا۔

ابراہیم:۔ کوئی اور حکم؟

جمال:۔ ہاں —— لیکن اس وقت نہیں، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

دونوں دوست خوش خوش روانہ ہو گئے۔

سلمیٰ کی مسرت تو حدِ بیان سے باہر تھی۔

---

(۲۲)

صُلح

جمال اور ابراہیم کی مصالحت نے سارے گھر بھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ اُم کلثوم کو بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ جمال اس قدر جلد من جائے گا۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی خلوص کی طاقت کتنی زبردست ہوتی ہے۔

یوسف اور صالح بھی اس نئے انقلاب سے بہت خوش تھے۔ خاص طور پر صالح صاحب تو وفورِ مسرّت سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

یوسف نے صالح کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

کہئے ——— تازہ خبر بھی سُنی حضور نے

صالح یوسف کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کون سی خبر؟"

یوسف :- یعنی یہ کہ آج اس گھر میں چچا جان صاحب رونق افروز ہیں۔

صالح :- باسی خبریں تازہ بنا کر نہ سنایا کرو۔

یوسف :- یہ باسی خبر ہے ؟

صالح :- اور کیا میں جمال چچا سے مل بھی آیا جا کر

یوسف :- صرف جمال چچا سے ؟

صالح :- نہیں، خدیجہ چچی سے بھی۔

یوسف :- صرف خدیجہ چچی سے ؟ اور کسی سے نہیں —— ؟ سُنا ہے کلی بھی تو آئی ہے —— ؟

صالح :- ہاں، سُنا تو میں نے بھی ہے۔

یوسف :- شنیدہ کے بود مانند دید —— سُننے سے کیا ہوتا ہے۔ جاؤ، مل بھی آؤ جا کر۔

صالح :- کیوں پٹوانا چاہتا ہے مجھ غریب کو —— ؟

یوسف :- رہنے دے، بُزدل —— اس طرح نہیں عشق کیا جاتا ہے۔

بے حوصلگی در عشق عجب طرفہ بلا ہے۔

صالح :- بھئی میرا تو یہ پہلا اور آخری عشق ہے۔ آپ ٹھیرے اس دشت کے سیاح اعظم ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

لہٰذا مرشد کی حیثیت سے ہاتھ بڑھائیے۔ میں بیعت کر لوں، پھر ہر حکم بسرو چشم بجا لاؤں گا۔

یوسف :۔ (ہنس کر) مذاق میں مت ٹالو ـــــ آخر کیوں نہیں ملتے سلمیٰ سے!

صالح :۔ موقع ملے گا تو مل بھی لوں گا۔

یوسف :۔ ابھی تو شاید سلمیٰ اور خدیجہ کا چند روز قیام رہے۔

صالح :۔ ہاں اُمید تو یہی ہے۔

یوسف :۔ بس پھر کیا ہے۔ دن عید رات شب برات۔

صالح :۔ دُعا کرو۔ خدا اصل مقصد پورا کرے۔ یوں خالی خولی ملنے سے کوئی فائدہ۔

یوسف :۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ دیکھ نہیں رہے ہو کس طرح اللہ میاں بگڑی ہوئی بات بنا رہے ہیں ـــ بھلا بظاہر یہ ممکن تھا کہ یوں صلح ہو جاتے۔

صالح :۔ تھا تو ناممکن۔

یوسف :۔ مگر خدا نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

صالح :۔ لیکن اُس سے زیادہ ناممکن یہ شادی کا مسئلہ ہے۔

یوسف :۔ انشاء اللہ یہ بھی ممکن ہو جائے گا ـــــ لیکن تم نے یہ بات کیوں کہی؟

صالح :۔ مجھے ایک بڑی پریشان کُن خبر ملی ہے۔

یوسف :۔ کس قسم کی خبر؟

صالح :۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جمال چچا سلمیٰ کی شادی اپنے ایک عزیز کے لڑکے سے طے کر رہے ہیں۔

یوسف :۔ بالکل غلط۔

صالح :۔ خدا کرے بالکل غلط ہو۔ لیکن مجھے معتبر ذریعہ سے اطلاع ملی ہے۔

یوسف :۔ (ہنس کر) تو ہو جانے دو سلمیٰ کی شادی۔ تم کسی اور سے کر لینا۔

خوبصورت لڑکیوں کی کچھ کمی ہے۔

صالح :۔ نہیں یوسف یہ نہ کہو۔

یوسف :۔ بُرا لگتا ہے۔

صالح :۔ ہاں بہت زیادہ

یوسف :۔ سلمیٰ کو بہت چاہتے ہو؟

صالح :۔ اب تم سے کیا کہوں کتنا زیادہ چاہتا ہوں ـــ کوئی انتہا ہو تو بتاؤں۔

یوسف :۔ یعنی بے انتہا۔

صالح :۔ یہی سمجھ لو۔

یوسف :۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ ـــ؟ تمھارا دعویٰ تو یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ یوسف کو چاہتا ہوں۔

صالح :۔ (ہنس کر) بے وقوف کہیں کے۔

یوسف :۔ نہیں، میں بھاگنے نہیں دوں گا۔ تمھیں جواب دینا پڑے گا۔

صالح :۔ ارے بھئی کہاں تم، کہاں وہ ـــ اس سے دوسری قسم کی محبت ہے۔ تم سے دوسری طرح کی۔

یوسف :۔ محبت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔

صالح :۔ کیوں نہیں ہوتیں؟ ـــ تم دوست ہو، وہ محبوبہ ـــ

یوسف :۔ ان دونوں میں فرق تو بہت ہے۔

صالح :۔ بہت زیادہ ـــ دوست دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔

یوسف :۔ اور محبوبہ؟

صالح :۔ وہ بھی بڑی گراں مایہ ہوتی ہے ۔ لیکن دوست سے کم ۔

یوسف :۔ تو تمہارے خیال میں دوستی محبت سے زیادہ پائیدار ہوتی ہے ؟

صالح :۔ بے شک

یوسف :۔ کیوں بناتا ہے مجھے ـــــ خیر میں تجھے امتحان میں نہیں ڈالتا ۔ لیکن ایک
بات ذہن میں آئی ہے کہ سنو گے تو پھڑک جاؤ گے ۔

صالح :۔ بس تو کہہ دو اُستاد ۔

یوسف :۔ اماں جان کو پٹی پڑھاتا ہوں کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں ۔

صالح :۔ بھئی ـــــ تمام معاملات طے کر دینا ۔

یوسف :۔ ہاں ـــــ بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ کم از کم نکاح تو ابھی کرا دیں ۔
رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی ۔

صالح :۔ ہاں تجویز تو بڑی معقول ہے ۔ لیکن اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمتی نظر
نہیں آتی ۔

یوسف :۔ خدا پر بھروسہ رکھو ۔ اگر یہ کام نہ کیا تو کچھ نہ کیا ۔

صالح :۔ اچھا دیکھیں گے ـــــ اور اگر تم نے ایسا کر لیا تو عمر بھر ـــــ

یوسف :۔ زیادہ باتیں نہ کرو ۔ مجھے میرا کام کرنے دو ۔

(۲۳)

وعدہ

یوسف نے اپنی ماں سکینہ سے کچھ ایسے انداز میں صالح کا ذکر چھیڑا کہ وہ بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے کہا۔

"میں آج ہی جمال اور ابراہیم سے اس معاملہ میں گفتگو کرتی ہوں ——— خدا چاہے گا تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم صالح کو مطمئن کر دو کہ گھبرائے نہیں ———"

اتفاق کی بات یوسف کے رخصت ہونے کے بعد، سکینہ جب ام کلثوم کی طرف گئی، تو سامنے صحن میں ابراہیم، جمال، خدیجہ اور اُم کلثوم سب ہی بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

سکینہ نے کہا۔

کچھ خاص باتیں ہو رہی ہیں ——؟ چلی جاؤں؟

ابراہیم :- آپ سے چھپا کر کوئی بات ہو سکتی ہے بھلا؟

سکینہ :- یہ بتاؤ میری تمنّا اور آرزو بھی تم لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے؟

ام کلثوم :- یہ آپ نے کیا کہا۔

ابراہیم :- آپ کی ہر آرزو اور تمنّا صرف اس لیے ہے کہ پوری کی جائے۔

ام کلثوم :- آپ کہہ کر تو دیکھئے۔

سکینہ :- کس سے کہوں؟

جمال :- جس سے چاہیے ——

سکینہ :- تم سے بھی —— تم بھی مان لو گے؟

جمال :- سر آنکھوں پر۔

سکینہ :- اور خدیجہ تم ——؟

خدیجہ :- میں بھی آپ کی ویسی ہی کنیز ہوں جیسی اُم کلثوم۔

سکینہ :- (مسکرا کر) لیکن ابراہیم تم کیوں چُپ ہو!

ابراہیم :- اس لیے کہ میں کہنے سے زیادہ کرنے کا قائل ہوں۔ اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا۔ لیکن آپ دیکھ لیں گی کہ آپ کے ایک لفظ پر اپنی جان تک کی بازی لگا دوں گا۔

سکینہ :- ہاں بھیّا مجھے یقین ہے۔

ام کلثوم :- تو پھر کہئے ——!

سکینہ :- کہتی تو ہوں۔ لیکن ایک دفعہ پھر تم لوگ دل ٹٹول لو۔

اُم کلثوم :- ٹٹول لیا۔

ابراہیم :- بالکل پروا نہ کیجئے۔ بس صرف اتنا کیجئے کہ کہہ دیجئے

سکینہ :- میری تمنا ہے کہ صالح ماشاء اللہ اب جوان ہو گیا، اس کی شادی کر دی جائے۔

ابراہیم :- ہو جائے گی۔

سکینہ :- لیکن کب؟

ابراہیم :- آپ ہی تاریخ بھی مقرر کر دیجئے۔

سکینہ :- لیکن کس سے؟

ابراہیم :- جس سے آپ چاہیں۔

سکینہ :- میری نظر میں تو جو لڑکی بچی ہے، وہ سلمیٰ ہے —— ! کیوں جمال اب کہو کیا کہتے ہو؟

جمال :- میں کیا عرض کروں —— آپ بزرگ ہیں۔ آپ کی رائے میرے لیے حکم ہے۔

سکینہ :- تو تمہیں منظور ہے؟

جمال :- اختلاف کی مجال ہی نہیں۔

سکینہ :- میں اُم کلثوم کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتی ہوں

اُم کلثوم :- اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی

سکینہ :- اور خدیجہ تم بھی بولو۔

خدیجہ:۔ میں بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتی۔ سوا اس کے کہ سر تسلیم خم ہے۔

سکینہ:۔ تو میں اگلا جمعہ مقرر کرتی ہوں ——— نکاح جب ہو جائے۔ رخصت سال کے بعد کی جائے گی۔ تاکہ سب انتظامات درست ہو جائیں۔

بجلی کی طرح یہ خبر سارے گھر میں پھیل گئی ——— اور مبارک سلامت کا شور برپا ہو گیا۔

---

(۲۴)

بات چیت

سلمیٰ اور صالح دونوں اس ملاپ سے خوش تھے ۔ جس نے ان دونوں کی زند
تلخ کر رکھی تھی ۔ ابراہیم اور جمال کی کشیدگی نے انہیں موت و زیست کی کش
میں گرفتار کر دیا تھا ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے لیکن
نے اُن کو ایک دوسرے سے دُور کر رکھا تھا ۔ سکینہ کی دو ٹوک باتوں نے ا
اور جمال کی کشیدگی ختم کر دی ۔ اس کے فیصلہ کن لہجے نے سلمیٰ اور صالح کی قسم
کا رُخ بدل دیا ۔ طے یہی پایا کہ نکاح کے ایک سال کے بعد رخصتی کی رسم انجام
جائے ۔ البتہ نکاح فوری طور پر کر دیا جائے ۔

جس وقت یوسف نے یہ خبر صالح کو دی ، اُس کا اضطراب و انبساط
دیدنی تھا ۔

جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

وہ بے حد خوش تھا اتنی مسرت شاید اُسے زندگی بھر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس اعلان کے دوسرے دن خدیجہ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ اس نے جلد از جلد قلیل مدت میں اُسے نکاح کی ضروری تیاریاں کرنی تھیں خدیجہ کے جانے کے بعد صالح کا جی چاہا کہ وہ بھی اُس کے ہاں جائے اور اکیلی سے ملے اور دیکھے کہ اس کے دل کا، اس فیصلہ کا، اس خبر کا اس کے قلب پر کیا اثر پڑا ہے۔ یوں تو وہ جب کبھی خدیجہ کے ہاں جاتا تھا، وہ بڑی خوشی سے ان دونوں ہجران نصیبوں کو مل بیٹھنے، باتیں کرنے اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہونے کا موقعہ دیتی تھی۔ لیکن اب دلہن سے ملنے کی اجازت دے گی یا نہیں؟ یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ اور اس کا کوئی جواب صالح کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

وہ اللہ پر بھروسہ کرکے خدیجہ کے ہاں پہنچا، اس نے سوچا اگر ملاقات نہیں ہوتی نہ ہو لیکن دیدار ہی کی کوئی صورت نکل آئے۔ دیدار نہیں تو ایک ہلکی سی جھلک ہی بہت ہے۔

یہی سوچتا ہوا وہ ایسے وقت خدیجہ کے ہاں پہنچا، جب جمال اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر شہر میں گیا ہوا تھا۔ خدیجہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی، اس نے کہا۔

"آؤ بیٹے آؤ۔ میں دعا کر رہی تھی کہ تم آجاؤ"

صالح:- میں حاضر ہو گیا۔ ارشاد فرمائیے کوئی کام ہے؟

خدیجہ:- کوئی خاص کام تو نہیں۔ لیکن تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

صالح:- ارشاد ___ میں گوش ہوش سے سن رہا ہوں۔

خدیجہ :۔ مجھے تمھاری سعادت اور شرافت پہ پورا بھروسہ ہے۔

صالح :۔ بندہ نوازی ہے آپ کی۔

خدیجہ :۔ تم سلمیٰ سے محبت کرتے ہو۔ میں بھی جانتی ہوں

(صالح نے سر جھکا لیا۔)

خدیجہ :۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلمیٰ بھی تم سے محبت کرتی ہے

(فرطِ مسرت سے صالح کا چہرہ کھل اٹھا۔)

خدیجہ :۔ لیکن تم دونوں ابھی کچی عمر کے ہو، تو خیر ناتجربہ کار۔ ——

صالح :۔ اس سے کیا ہوتا ہے چچی جان؟

خدیجہ :۔ نہیں بیٹے، یہ نہ کہو۔ اس سے بہت کچھ ہوتا ہے۔

صالح :۔ میں نہیں سمجھا۔

خدیجہ :۔ ہاں، یہ باتیں تمھاری سمجھ میں آنا مشکل بھی ہیں۔ لیکن میں ضرور رکھوں گی۔

صالح :۔ میں بڑی توجہ سے سن رہا ہوں —— فرمایئے!

خدیجہ :۔ پختہ عمر میں بھی انسان جو وعدے کرتا ہے، جو عہد کرتا ہے، جو اصول بناتا ہے۔ جو فیصلے کرتا ہے۔ جو راہِ عمل متعین کرتا ہے۔ بعد میں یہ سب چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ ٹوٹتی رہتی ہیں۔ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں۔

صالح :۔ بجا فرمایا آپ نے —— ہاں ایسا ہوتا رہتا ہے۔

خدیجہ :۔ پھر سوچو تو نوعمری میں انسان جو عہد کرتا ہے کیا اس کی پختگی اتنی

استحکام کا بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

صالح:۔ نہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم دونوں آگے چل کر عہد وفا نباہ نہ سکیں گے۔

خدیجہ:۔ ہاں بیٹے میرا یہی مطلب ہے ——— غلط ہے کچھ!

صالح:۔ آپ بزرگ ہیں، آپ کی بات کو غلط کہنا تو گستاخی اور بدتمیزی ہے لیکن ———

پھر وہ چپ ہو گیا۔

خدیجہ:۔ نہیں، نہیں، تم کہو۔ کیا کہہ رہے تھے؟

صالح:۔ میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ میرا جہاں تک تعلق ہے، آپ کو کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیے۔

خدیجہ:۔ نہیں بیٹے میں اندیشہ نہیں کرتی۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ اور بس۔

صالح:۔ لیکن اس بات کے کہنے کا کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔

خدیجہ:۔ ہاں ——— مقصد یہ تھا کہ ایک مرتبہ اپنے فیصلہ پر، ارادے پر عہد پر پھر غور کر لو۔

صالح:۔ چچی، میں اچھی طرح غور کر چکا ہوں۔

خدیجہ:۔ تم سلمیٰ کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میں اُس کے مزاج، طبیعت، جبلّت، طینت ہر چیز سے واقف ہوں۔

صالح:۔ بے شک۔ اس میں کون شبہ کر سکتا ہے۔

خدیجہ :- میں جس طرح اُس کی خوبیوں سے واقف ہوں، اُسی طرح اُس کی کمزوریاں بھی میری نظر میں ہیں۔

صالح :- کمزوریاں ——؟

خدیجہ :- ہاں —— اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ معصوم ہے۔ اس میں کوئی خامی نہیں، کمزوری —— تو یہ غلطی ہے۔ اور اس غلطی کی اصلاح ہونا چاہیئے

صالح :- کمزوری سے کون بشر خالی ہے۔ یہ تو انسانیت کا لازمہ ہے۔

خدیجہ :- ہاں بے شک۔

صالح :- ایسا میں ان سے ذرا بھی نہیں گھبراتا۔

خدیجہ :- وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کم از کم تمہیں اس کی کمزوریوں کا علم ہونا چاہیے۔

صالح :- خدائے واحد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج تک میں نے سلمیٰ میں کوئی کمزوری نہیں دیکھی۔

خدیجہ :- ٹھیک ہے لیکن جو کچھ میں جانتی ہوں، اُسے چھپانا نہیں چاہتی۔

صالح :- فرمایئے ——!

خدیجہ :- وہ ضدی بہت ہے۔

صالح :- اونہہ —— میں ذرا بھی ضدی نہیں ہوں۔ اور میں بھی اگر ضدی ہوتا تو بے شک یہ سوال قابلِ غور ہوتا۔

خدیجہ :- وہ نکتہ چینی اور اعتراض کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بہت جلد

بھڑک اُٹھتی ہے۔

صالح :۔ اس میں ہنسی کی کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت ہے۔ تو وہ نکتہ چینی اور اعتراض ہی ہے۔

خدیجہ :۔ (حیرت سے) یہ کیوں؟

صالح :۔ نکتہ چینی اور اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو خود کچھ نہیں کرتے جو خود پسند ہوتے ہیں۔ جو اپنے سوا سب کو پیکرِ معائب خیال کرتے ہیں۔ لہذا قابلِ اعتراض وہ لوگ ہیں۔ جو نکتہ چینی کرتے ہیں۔ نہ کہ وہ جن پر نکتہ چینی کی جائے۔

خدیجہ :۔ یہ تو عجیب سی بات کہہ دی تم نے!

صالح :۔ جی میں غلط نہیں کہتا۔ نکتہ چینی سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ غصہ پیدا ہوتا ہے، عناد اور مخالفت کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔ کام نہیں بنتا۔

خدیجہ :۔ کام کس طرح بنتا ہے۔

صالح :۔ عملی افہام و تفہیم سے۔

خدیجہ :۔ یعنی ——؟

صالح :۔ مثلاً، میں نے کوئی ایسی بات کی، جو آپ کو ناپسند ہے، آپ نکتہ چینی نہ کیجئے۔

خدیجہ :۔ پھر کیا کروں؟

صالح :۔ موقعہ محل دیکھ کر سمجھا دیجئے۔ دوست، ہمدرد بن کر۔ اقادٗ

اور نکتہ چین بن کر نہیں ۔

خدیجہ :۔ ہوں ——

صالح :۔ اسی طرح اگر آپ سے اس طرح کی کوئی حرکت سرزد ہو تو مجھے کرنا چاہیئے —— بس کام بن جائے گا ۔

خدیجہ :۔ خدیجہ (مسکرا کر) واہ رے ۔ تو تو اپنی عمر اور تجربہ سے بہت آگے نکل گیا ہے ۔

صالح :۔ یہ مطالعہ کا نتیجہ ہے پھپھی جان ۔

خدیجہ :۔ ایک بات اور —— !

صالح :۔ وہ بھی فرما دیجئے ۔

خدیجہ :۔ سلمیٰ میں ایک خامی اور بھی ہے ۔

صالح :۔ آپ کو جو کچھ معلوم ہے ۔ سب فرما دیجئے ۔ میں بڑے غور سے سن رہا ہوں ۔

خدیجہ :۔ وہ کسی کی حاکمیت نہیں مانتی

صالح :۔ وضاحت سے فرمایئے ——

خدیجہ :۔ مطلب یہ کہ وہ طبعاً حکومی کو ناپسند کرتی ہے ۔ کوئی اگر حاکم اور مالک بن کر اس سے کچھ کہے یا کوئی کام لینا چاہے ، تو اچھی بات ماننے سے بھی وہ انکار کر دیتی ہے ۔

صالح :۔ (ہنس کر) واقعی —— ؟

خدیجہ :۔ ہاں بیٹے —— !

صالح :- یہ تو بڑی اچھی عادت ہے۔

خدیجہ :- (متعجب ہوکر) کیا کہا ؟ یہ بڑی اچھی عادت ہے۔

صالح :- جی ـــــ میں تو اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

خدیجہ :- وہ کس طرح لڑکے ؟

صالح :- جس آدمی میں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خودداری اور خودشناسی کا مادّہ نہ ہو وہ اس قابل نہیں کہ اُسے آدمی کہا جائے۔ وہ ننگِ انسانیت ہے۔ اور میں ایسے آدمی سے محبّت بالکل نہیں کرسکتا ہوں۔

خدیجہ :- (ہنس کر) واہ بھئی عجیب لڑکے سے پالا پڑا ہے۔

صالح :- جی چچی جان ـــــ بات یہ ہے کہ آپ نے جب سلمیٰ کی کمزوری کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں اپنی فطرت بھی آپ کے سامنے پیش کردوں۔ خواہ وہ بُری ہو یا بھلی۔

خدیجہ :- اچھا کیا تم نے ـــــ واقعی مجھے تمھارے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اور مجھے مسرّت ہے کہ اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے۔ جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔

صالح :- مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے۔

خدیجہ :- اچھا، یہ تو تمھارے بارے میں ہوا۔ اب کچھ اور پوچھوں ؟

صالح :- ضرور، ضرور

خدیجہ :- دیکھو، تم یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے گھر والوں کے بارے میں میری

رائے بُری ہے۔

صالح: استغفر اللہ ـــــ ایسا کیونکر سمجھ سکتا ہوں؟

خدیجہ: ـ میرا مقصد صرف تمام پہلوؤں کو اُجاگر کر کے اُن پر غور و بحث کرنا ہے۔

صالح: ـ بالکل ٹھیک۔

خدیجہ: ـ ورنہ تم جانتے ہو۔ ابراہیم کو میں اپنا بھائی سمجھتی ہوں اور ام کلثوم کو تو بہن سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔

صالح: ـ معلوم ہے چچی جان ـــــ!

خدیجہ: ـ اب سوچو، اگر ام کلثوم یا ابراہیم نے آگے چل کر سلمیٰ کی کوئی بات ناپسند کی؟

صالح: ـ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ قطعاً ناممکن۔

خدیجہ: ـ مثلاً کا ہر پہلو سوچ لینے میں کیا قباحت ہے؟

صالح: ـ جی ہاں، وہ تو ٹھیک ہے۔

خدیجہ: ـ میرا مقصد یہ ہے کہ تم نے اپنے بارے میں تو بتا دیا کہ میری نظر میں سلمیٰ کی جو کمزوریاں ہیں انھیں تم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ پسند کرتے ہو۔

صالح: ـ بے شک۔

خدیجہ: ـ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ام کلثوم اور ابراہیم کا نقطۂ نظر بھی ایسا ہو۔

صالح :— ضروری ہے چچی جان

خدیجہ :— وہ کس طرح بیٹے ؟

صالح :— اس لیے کہ میں نے انہی دونوں کی گود میں آنکھ کھولی —— انہی کے سایۂ عافیت میں پرورش پائی ہے ، انہی کا مزاج اور طبیعت لے کر پیدا ہوا ہوں ۔ لہٰذا مجھ میں اور اُن میں فرق کیسے ہو سکتا ہے

خدیجہ :— یہ نہ کہو بیٹے ۔

صالح :— کیوں چچی جان ؟

خدیجہ :— ماں باپ اور اولاد کے مزاج اور افتادِ طبیعت میں بعض اوقات نہ صرف اختلاف بلکہ تضاد بھی ہوتا ہے ۔

صالح :— ہوتا ہوگا ۔

خدیجہ :— میں اسی امکان پر بحث کر رہی ہوں —— اگر ایسا ہوا تو ؟

صالح :— اوّل تو ایسا ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہوا اور آپ نے محسوس کیا کہ سلمیٰ اس گھر میں خوش نہیں رہ سکتی تو آپ جانتی ہیں ۔ میں کیا کروں گا ؟

خدیجہ :— نہیں —— !

صالح :— اُس صورت میں سلمیٰ کو لے کر الگ رہنے لگوں گا ۔

خدیجہ :— ماں باپ کو ناراض کر دو گے —— کیوں ؟

صالح :— بالکل نہیں ۔

خدیجہ :— وہ تو ہوا ہی جائیں ۔

صالح :— جی نہیں، اُن کی پوری خدمت کروں گا۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادوں گا۔ اس لیے کہ وہ میرے ماں باپ ہیں سلمیٰ کے نہیں۔ سلمیٰ سے وہ خدمت صرف اس طرح لے سکتے ہیں۔ کہ اسے اپنا بنا لیں۔ لیکن اگر وہ اُسے اپنا نہیں بنا سکتے تو سلمیٰ کو بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اُن کی لونڈی بنے

خدیجہ :— کیا کہہ رہا ہے تو لڑکے —؟

صالح :— میں غلط نہیں کہتا۔

خدیجہ :— میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہ ماں باپ نے حکم دیا۔ اور لڑکے نے بغیر کسی خطا قصور کے بیوی کو طلاق دے دی۔

صالح :— دیکھا ہوگا۔

خدیجہ :— تو ایسا نہیں کرے گا۔

صالح :— قطعاً نہیں۔

خدیجہ :— میں یہ پوچھتی ہوں کیوں؟

صالح :— عرض تو کر چکا —— ماں باپ کا حق صرف یہ ہے کہ میں اُن کو راحت پہنچاؤں، اُن کی خدمت کروں، ان کی ضروریات و احتیاجات کا خیال کروں۔ ان کی ہر بات پوری کروں —— بس، اس کے بعد میں کیا کھاتا ہوں، کیا پیتا ہوں، کیا کام کرتا ہوں، کس سے شادی کرتا ہوں یا کس سے دوستی کرتا ہوں۔ یہ میرے نجی معاملات ہیں۔ ان سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔

خدیجہ:۔ (مطمئن ہوکر) یہ باتیں میں نے آج تجھ سے سُنی ہیں۔

صالح:۔ لیکن آپ بتلایئے غلط تو نہیں۔؟

خدیجہ:۔ بالکل صحیح ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ماں باپ کی ذہنیت ان باتوں کو کفر سمجھتی ہے۔

صالح:۔ سمجھا کرے۔

خدیجہ:۔ تو یہ ہیں تمھارے خیالات و نظریات

صالح:۔ جی

خدیجہ:۔ دیکھو تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے یہ باتیں اس لیے چھیڑی تھیں کہ جو کچھ میں نے پوچھا۔ اور جو کچھ تم نے کہا۔ وہ ہوگا۔

صالح:۔ جی نہیں۔

خدیجہ:۔ میری سلمیٰ کو تاکید ہوگی کہ وہ تم سے زیادہ ابراہیم اور اُم کلثوم کا خیال رکھے۔

صالح:۔ یہ الگ بات ہے۔

خدیجہ:۔ اس وقت جو باتیں میرے تمھارے مابین ہوئی ہیں یہ صرف میرے اور تمھارے مابین ہوئی ہیں۔ کسی تیسرے کو انھیں بتلانے کی ہیں اجازت نہیں دیتی۔

صالح:۔ اطمینان رکھئے۔ ایسا ہی ہوگا۔

خدیجہ:۔ سلمیٰ کے کان تک یہ باتیں کبھی نہ پہنچنے پائیں۔ سمجھے؟

صالح:۔ اس حکم کی تعمیل بھی ہوگی۔ لیکن اس تک اگر یہ باتیں کبھی پہنچ

جائیں تو کیا مضائقہ ہے ۔؟

خدیجہ :۔ ہے ـــــ پھر وہ خدمت کا نظریہ ترک کرکے انہی باتوں پر غور کرنے لگے گی ۔

صالح :۔ وہ اس طرح کی لڑکی نہیں ۔

خدیجہ :۔ (ہنس کر) یہ کوئی بتانے کی باتیں ہیں ؟

صالح :۔ کیوں بچی ؟

خدیجہ :۔ (مسکراتے ہوئے) تو کیا جانے وہ اس طرح کی لڑکی ہے یا نہیں

صالح :۔ میرا دل کہتا ہے ۔

خدیجہ :۔ بیوقوف چھوکرا ـــــ بہرحال میری اس تاکید پر عمل کرنا تیرا فرض ہے

صالح :۔ بہت خوب ـــــ !

خدیجہ خاموش ہوگئی ـــــ !

صالح صاحب نے سوچا، کافی باتیں ہوئیں، اب یہاں زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع نہیں ۔ رہی سلمیٰ، تو اس سے ملاقات تو کیا ہوتی، نہ دیدار ہو نہ جھلک دکھائی دی ۔ نہایت مایوسی کے عالم میں انھوں نے فیصلہ کیا اب یہاں سے رخصت ہونا چاہیے ۔ بار بار کنکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھتے جاتے تھے ۔ کہ شاید سلمیٰ نظر آجائے ۔ لیکن وہ کہاں نظر آتی تھی ۔

آخر اُس نے کہا ۔

"کیا اب تم جاؤ گے ؟"

وہ بولا۔

"جی ہاں ——— اب اجازت دیجئے۔ پھر انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔"

نور یجہ نے کہا۔

"لیکن میں چاہتی ہوں تم سلمیٰ سے مل لو۔"

یہ سُن کر صالح کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

صالح :— جی کیا فرمایا آپ نے ؟

نوریجہ :— میں چاہتی ہوں تم سلمیٰ سے مل لو ——— میں غلط قسم کی رسموں کو نہیں مانتی۔ جب ہمارے مذہب نے شادی سے پہلے ایک دوسرے سے واقف ہونے کی اجازت دی ہے، تو میں سنگِ راہ کیوں بنوں ؟—
جاؤ وہ پہلے کمرے میں بیٹھی ہے

---

(۲۵)

راز و نیاز

خوشی اور مسرت سے بے خود ہو کر صالح، سلمیٰ کے کمرے میں پہنچا
وہ اس وقت تک صالح کے آنے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ کچھ
اس وقت کسی گہری فکر تھی۔ وہ بھی شاید یہ سوچ رہی تھی کہ شادی کے بعد
زندگی کس طرح گزرے گی؟ وہ بہت فکر مند اور مضطرب نظر آ رہی تھی۔ وہ
ایک تخت پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، اور سامنے فضا کی طرف ٹکٹکی
لگائے دیکھ رہی تھی۔

یک بیک صالح جو پہنچا تو وہ اُسے دیکھ بھی نہ سکی۔ صالح نے اس کی
یہ کیفیت بھانپ لی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا بالکل اُس کے پاس پہنچ
گیا۔ اب وہ اُسے دیکھ کر چونک پڑی۔

"ارے آپ ؟"

صالح :- ہاں ۔ میں ہوں صالح ——— تمھارا پرستار !

وہ مسکرادی

"بیٹھئے بھی ——— !"

صالح پیچھے دو قدم ہٹ گیا ۔ اُس نے کہا ۔

"ہٹ گیا ——— اب یہ نہ کہہ دینا جایئے بھی ۔"

سلمیٰ :- (مسکرا کر) جایئے بھی

پھر اُس نے ایک انداز کے ساتھ دانتوں تلے اُنگلی داب لی ۔ اور کہا ۔

"نہیں نہیں ، آیئے ——— !

صالح آکر قریب ہی بیٹھ گیا ۔ اُس نے کہا ۔

"حاضر ہو گیا ——— !"

سلمیٰ :- پہلے یہ بتایئے آپ یہاں تک آ کیسے گئے ؟

صالح :- بس آ گیا ۔

سلمیٰ :- اتاں کی آنکھ میں دُھول جھونک کر ۔

صالح :- توبہ کرو ۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے ۔

سلمیٰ :- تو کس طرح آئے ؟ اُن سے پوچھ کر ؟

صالح :- اور کیا ؟

سلمیٰ :- انھوں نے اجازت دے دی ؟

صالح :- نہیں — منع کیا —— !

سلمیٰ :- پھر بھی آپ آگئے ؟

صالح :- کیا کرتا - دل نہیں مانا — !

سلمیٰ :- اور اگر وہ آگئیں ؟

صالح :- معافی مانگ لوں گا -

سلمیٰ :- نہ معاف کیا تو ؟

صالح :- واہ - وہ تمھاری طرح تنگ دل نہیں ہیں -

سلمیٰ :- میں تنگ دل ہوں — ؟

صالح :- اور کیا ہو ؟ — آج تو تمھاری بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں -

سلمیٰ :- کس سے ؟

صالح :- چچی سے — اور کس سے ؟

سلمیٰ :- امّاں سے ؟

صالح :- ہاں جی ہاں -

سلمیٰ :- کیا کیا ؟ — بتایئے ؟

صالح :- بتا تو دوں ، لیکن سُن کر تم خوش نہیں ہوگی -

سلمیٰ :- اے واہ تو کیا وہ میری بُرائیاں کر رہی تھیں ؟

صالح :- ہاں جی ہاں - !

سلمیٰ :- غلط بالکل جھوٹ

صالح :- بالکل سچ -

سلمیٰ :- میں نہیں مانتی -

صالح :- کیوں آخر ؟

سلمیٰ :- کوئی مائی اپنی لڑکی کی بُرائی نہیں کر سکتی ۔

صالح :- بعض حق پرست ، صاف گو اور صادق القول مائیں ہر حالت میں سچ بولتی ہیں ۔

سلمیٰ :- لیکن مجھ میں ایسی کون سی برائیاں ہیں جن کا ذکر کیا تھا ۔

صالح :- ایک تو یہی ہے کہ اپنے اندر تمہیں برائی کا گمان بھی نہیں ۔

سلمیٰ :- اور آپ کو ؟ آپ کو ہے ؟

صالح :- کیوں نہیں ہے ـــــ میں تو حقیر سراپا تقصیر ہوں ۔

سلمیٰ :- خیر اپنا قصّہ چھوڑیئے ۔ یہ بتایئے کہ اماں کیا کہہ رہی تھیں میرے بارے میں ؟

صالح :- بتا دوں ؟

سلمیٰ :- ہاں ۔ آپ کو قسم ہے ۔

صالح :- اب نہیں بتاؤں گا

سلمیٰ :- کیوں ؟

صالح :- تم نے قسم کیوں دلائی ؟

سلمیٰ :- اچھا ، میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں ۔

صالح :- اب بتا دوں گا ۔

سلمیٰ :- تو کہئے بھی نا کسی طرح ؟

صالح :- کہہ رہی تھیں ـــــــــ

سلمیٰ :۔ پھر آپ رُک گئے ۔ کہتے کیا کہہ رہی تھیں ؟

صالح :۔ کہہ رہی تھیں ـــــ نہیں تم خفا ہو جاؤ گی ۔

سلمیٰ :۔ نہیں ، خفا نہیں ہونے کی ـــــ اور اگر ہوئی بھی تو آپ سے کیوں ہونے لگی ـــــ !

صالح :۔ پھر کس سے ہو گی ؟ ـــ بچی سے ؟

سلمیٰ :۔ اور کیا ـــ !

صالح :۔ یہ لو ۔ تاکہ تم اُن سے خفا ہو ، اور وہ مجھ سے خفا ہو جائیں تم اس لیے خفا ہو گی کہ میں نے اُن کی بات تم سے کیوں کہہ دی ، اور وہ اس لیے برہم ہوں گی کہ میں نے لگائی بجھائی کیوں کی ؟ ـــــ نا بابا ، میں اس جھگڑے میں نہیں پڑتا ۔

سلمیٰ :۔ تو یہ کہیے آپ کہنا نہیں چاہتے ـــــ صاف بات !

صالح :۔ میں کہنے پر تیار ہوں ۔ بس یہ وعدہ کر لو کہ اُن سے خفا تو نہیں ہو گی ؟

سلمیٰ :۔ اچھا وعدہ کرتی ہوں ۔

صالح :۔ صدق دل سے ؟

سلمیٰ :۔ ہاں صدق دل سے !

صالح :۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ سلمیٰ ضدی بہت ہے ۔

سلمیٰ :۔ (مسکرا کر) اور ـــ ؟

صالح :۔ پہلے بتاؤ ، یہ بات سچ ہے یا غلط ؟

سلمیٰ :۔ غلط ـــــ نہیں سچ

صالح :۔ مانتی ہو۔ اقرار کرتی ہو؟

سلمیٰ :۔ ہاں ـــــ سچی بات کیسے نہ مانوں گی ـــــ اور کیا کہہ رہی تھیں؟

صالح :۔ اُنھوں نے کہا سلمیٰ کسی کی نکتہ چینی ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔

سلمیٰ :۔ یہ بھی سچ کہا ـــــ لیکن اُنھوں نے آپ سے یہ کیوں کہا آخر؟

صالح :۔ اس لیے کہ میں کبھی تم پر نکتہ چینی نہ کروں۔

سلمیٰ :۔ اُنھیں کیا ـــــ آپ جانیں اور ہم جانیں۔

صالح :۔ نہیں۔ یہ نہ کہو۔ وہ ماں ہیں۔ اپنی چہیتی لڑکی کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچتی ہیں۔

سلمیٰ :۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہیں۔

صالح :۔ اور تم ـــــ؟

سلمیٰ :۔ میں بھی بہت چاہتی ہوں۔ حد سے زیادہ

صالح :۔ یعنی مجھ سے بھی زیادہ؟

سلمیٰ :۔ یہ لیجیے ـــــ اس سوال کا کیا تک ہے؟

صالح :۔ کیوں نہیں ہے؟ ـــــ بتاؤ؟

سلمیٰ :۔ نہیں بتاتے۔

صالح :۔ ہم تو پوچھ کر رہیں گے۔

سلمیٰ :۔ ہرگز نہیں بتاؤں گی۔

صالح :۔ یعنی ثابت کرنا چاہتی ہو۔ کہ واقعی بہت زیادہ ضدّی ہو۔

سلمیٰ :۔ یہی سہی

صالح :۔ بنا دو ـــــ تم تو بڑی اچھی لڑکی ہو۔

سلمیٰ :۔ آپ سے جو محبّت ہے وہ دوسری طرح کی ہے۔ اور اماں
جو ہے وہ دوسری طرح کی۔

صالح :۔ تو کیا محبّت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں ؟

سلمیٰ :۔ کیوں نہیں ہوتیں۔

صالح :۔ مثلاً ؟

سلمیٰ :۔ آدمی اپنی بہن کو چاہتا ہے۔ بھائی کو چاہتا ہے۔ ماں باپ کو چا
ہے۔ دوستوں اور ساتھیوں کو چاہتا ہے ـــــ لیکن اس کی محبّت
ہر ایک سے جُدا گانہ حیثیت رکھتی ہے۔

صالح :۔ (کچھ سوچ کر) ہاں ـــــ یہ تو ٹھیک ہے۔

سلمیٰ :۔ بہت بہت شکریہ ! اس قدر جلد سمجھ لینے کا۔

صالح :۔ چچی ایک بات اور بھی کہہ رہی تھیں تمھارے بارے میں۔

سلمیٰ :۔ مختصر یوں کہہ لیجئے کہ وہ کہہ رہی تھیں سلمیٰ تنگ خلائق ہے۔ اس
میں تمام بُرائیاں ہی بُرائیاں ہیں۔ وہ بڑی بے ادب اور بیہودہ ہے
اس قابل نہیں کہ اُسے کوئی مُنہ لگائے ـــــ ہیں نا !

صالح :۔ توبہ کرو۔ بالکل غلط خیال ہے تمھارا۔

سلمیٰ :۔ تو فرمائیے اور کیا انکشاف کیا انھوں نے ؟

صالح :۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ سلمیٰ کسی کی حاکمیت بھی نہیں برداشت کر سک

سلمیٰ :۔ یعنی ——— ؟

صالح :۔ یعنی یہ کہ تم کسی کی محکومی برداشت کرنا اپنی توہین سمجھتی ہو۔

سلمیٰ :۔ (نخوت سے) بے شک ——— یہ اگر کمزوری ہے تو مجھ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

صالح :۔ کیا مطلب ؟

سلمیٰ :۔ میں نے کوئی پہیلی نہیں بجھائی۔

صالح :۔ یعنی تم کسی کی محکوم نہیں بن سکتیں ؟

سلمیٰ :۔ نہیں ——— کیوں بنوں کسی کی محکوم ؟

صالح :۔ میری بھی نہیں ؟

سلمیٰ :۔ جی نہیں۔

صالح :۔ پھر سوچ لو سلمیٰ۔ !

سلمیٰ :۔ خوب سوچ لیا۔

صالح :۔ تمہارا یہ فیصلہ اٹل ہے ؟

سلمیٰ :۔ ہاں پہاڑ کی طرح۔

صالح :۔ شوہر اور بیوی میں سے ایک کو لامحالہ حاکم اور دوسرے کو محکوم بننا پڑتا ہے ——— تمہارا مطلب یہ ہے۔ کہ میں محکوم بنوں اور تم حاکم ؟

سلمیٰ :۔ جی بالکل نہیں۔

صالح :۔ پھر کیا ہے ؟

سلمیٰ :۔ شوہر اور بیوی بھی دوست، رفیق، ساتھی اور ہمدم کی طرح رہتے ہیں ۔ اسی طرح رہنا چاہیئے ۔ یہ کیا ضروری ہے ۔ کہ حاکمیت اور محکومیت کی بھی اس میں آویزش ہو؟

صالح :۔ تمھارا یہ خیال ہے ۔

سلمیٰ :۔ جی ——— اور آپ کا؟

صالح :۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تم سے متفق نہیں ہوں تو ؟

سلمیٰ :۔ تو جواب میں مجھے کہنا پڑے گا ۔ کہ میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتی ۔

صالح زور زور سے ہنسنے لگا ۔

سلمیٰ :۔ کیوں آپ ہنس رہے ہیں؟ میں نے کوئی احمقانہ بات کی؟

صالح :۔ نہیں ——— تم بہت عقلمند ہو ۔

سلمیٰ :۔ اتنی زیادہ کہ میری باتوں پر آپ کو ہنسی آجاتی ہے ۔

صالح :۔ نہیں بھئی ہنسی تو اپنی ایک بات پر آئی ہے ۔

سلمیٰ :۔ تو ہمیں بھی بتایئے وہ بات کیا ہے؟

صالح :۔ ابھی میں نے چچی سے کہا تھا کہ سلمیٰ ضدی ہو گی ۔ لیکن اگر افہام و تفہیم سے کام لیا جائے تو بات مان جائے گی ۔ اس وقت میرا خیال صحیح ثابت ہوا ۔ ابھی جب تم سے ایک بات پر اکڑ گئے تو میں نے ایک معقولیت بھرے جملہ میں تمھیں نرم کر لیا ۔

سلمیٰ :۔ (مسکرا کر) ہوں ۔

صالح :۔ میں نے چچی سے یہ بھی کہا تھا ۔ کہ جس مرد یا عورت میں خود دار

اور خود شناسی نہ ہو، اُسے میں ننگِ انسانیت سمجھتا ہوں۔ اس سے نفرت کر سکتا ہوں۔ محبّت نہیں۔

سلمیٰ :- کیوں کیا تھا یہ؟

صالح :- چچی کہہ رہی تھیں سلمیٰ کسی کی حاکمیت برداشت نہیں کر سکتی۔

سلمیٰ :- اچھا یہ بات ہے۔

صالح :- ہاں ___ اور اس وقت میں نے دیکھ لیا کہ میرا خیال تمھارے بارے میں کتنا صحیح ہے!

سلمیٰ :- اسی پہ آپ ہنس رہے تھے۔

صالح :- اور کیا؟ ___ چچی کہہ رہی تھیں میں نے سلمیٰ کو پیدا کیا ہے اس کے مزاج اور فطرت سے جتنی میں واقف ہوں تو نہیں ہو سکتا۔

سلمیٰ :- اور آپ کہہ رہے تھے کہ نہیں میں بھی اس کے مزاج اور فطرت سے خوب واقف ہوں۔

صالح :- ہاں ___ اور تم نے دیکھ لیا، میں نے کتنی سچی کہی تھی۔

سلمیٰ :- کیا کہنا ہے آپ کی فراست اور ذہانت کا!

صالح :- یہ باتیں چھوڑو سلمیٰ کچھ اور باتیں کرو۔

سلمیٰ :- یہ باتیں آپ ہی نے چھیڑی تھیں۔ اب آپ دوسری باتیں شروع کر دیجئے۔ میں بھی اسی رنگ میں رنگ جاؤں گی۔

صالح :- کچھ آئندہ زندگی کے بارے میں بھی سوچا؟

سلمیٰ :- میں ایک بات کو بار بار نہیں سوچ سکتی۔

صالح :۔ یعنی سوچ چکیں۔

سلمیٰ :۔ ہاں ۔ ایک مرتبہ سوچ کر جو فیصلہ کر لیتی ہوں وہ اٹل ہوتا ہے۔

صالح :۔ لیکن خدارا یہ تو بتاؤ کہ یہ دن کیسے کاٹے گئیں گے؟

سلمیٰ :۔ کون سے دن؟

صالح :۔ یہ ہجر و فراق کے دن اور راتیں؟ غضب خدا کا کامل ایک سال۔

سلمیٰ :۔ جیسے اتنے دن کٹ گئے، یہ بھی کٹ جائیں گے۔

صالح :۔ لیکن اب میرا ضبط میرے امکان سے باہر ہے۔

سلمیٰ :۔ یہی انسانیت کا جوہر ہے جس میں صبر و ضبط نہیں وہ انسان نہیں

صالح :۔ یعنی وہ حیوان ہے ـــــ میں انسان سے حیوان بن گیا۔

سلمیٰ :۔ (ہنس کر) ہر بات آپ اپنے اوپر کیوں چسپاں کر لیتے ہیں؟

صالح :۔ ہاں سلمیٰ! جب تک شادی کا مسئلہ طے نہیں ہوا تھا میں مایوس تھا اور یہ مایوسی مجھے صابر و شاکر بنائے ہوئے تھی۔ جب سے شادی کا مسئلہ طے ہو لیا ہے، صبر کا دامن ہاتھ سے چھٹتا جا رہا ہے۔

سلمیٰ :۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟

صالح :۔ ایک میرے لیے عمر نوح سے کم نہیں۔

سلمیٰ :۔ اگر آپ اپنے ساتھ میری حالت اور کیفیت کا اندازہ کریں تو فوراً صبر کی ہمت پیدا ہو جائے گی۔

صالح :۔ تمھاری حالت؟ تمھاری کیفیت؟

سلمیٰ :۔ جی ـــــ میں بھی آدمی ہوں۔ میں بھی محبت کرتی ہوں۔ ہجر و فراق

کی تلخیاں میرے لیے بھی سوہان روح ہیں۔ لیکن میں کسی طرح جبر کر رہی ہوں ——— آپ یہ نہیں سوچئے کہ آپ تنہا نہیں ہیں۔ آپ کا ایک ساتھی بھی ہے۔ اور اُس کی بھی وہی حالت ہے جو آپ کی — یہ کہ ممکن ہے اس کی حالت آپ سے زیادہ

اس سے آگے سلمیٰ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

صالح اس کی یہ کیفیت دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔

صالح :— سلمیٰ! سلمیٰ!!

سلمیٰ نے آنسو پونچھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

سلمیٰ :— کہیئے ———!

صالح :— اب مجھے صبر آگیا۔ اب مجھ میں صبر کی ہمت پیدا ہو گئی۔ اب میں خدا بھی بے قراری اور بے تابی کا اظہار نہیں کروں گا۔

سلمیٰ :— کیوں؟

صالح :— میں نے تمہیں دیکھ لیا۔

سلمیٰ :— شکریہ۔

صالح :— لیکن ایک وعدہ کرو۔ کرنا پڑے گا تمہیں وعدہ۔

سلمیٰ :— کاہے کا وعدہ؟ کس قسم کا وعدہ؟

صالح :— یہ کہ مجھ سے ملتی رہو گی؟

سلمیٰ :— میں کس طرح وعدہ کر سکتی ہوں۔ یہ بات میرے اختیار سے باہر

ہے۔ ہاں اماں اگر چاہیں تو آپ کا آنا جانا جاری رہ سکتا ہے

صالح :۔ نہیں۔ وہ مجھ سے بھی بہت محبّت کرتی ہیں۔ وہ ہرگز ہمارے ملنے جلنے میں مخل نہیں ہوں گی۔

سلمیٰ :۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

صالح :۔ کیوں کیا تمھیں شُبہ ہے کچھ ؟

سلمیٰ :۔ نہیں۔ شبہ تو نہیں۔ لیکن یہ تو حالات پر منحصر ہے ——— ؟ اگر والد نے اعتراض کیا تو وہ ہمارے لیے کیا کر سکیں گی ——— ؟

صالح :۔ میں اُنھیں اعتراض کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔

سلمیٰ :۔ وہ کس طرح ؟

صالح :۔ ہمیشہ ایسے وقت آؤں گا کہ وہ یہاں موجود نہ ہوں ——— پھر تو وہ اعتراض نہیں کر سکتے۔

سلمیٰ :۔ (زیرِ لب تبسّم کے ساتھ) آپ واقعی بڑے ذہین ہیں۔

صالح :۔ تم سے کم ——— تمھاری گرد تک کو بھی میں نہیں پہنچ سکتا۔

اتنے میں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ دونوں خاموش ہو گئے

یہ خدیجہ تھی۔

خدیجہ کو دیکھ کر سلمیٰ نے سر جُھکا لیا۔ صالح کھڑا ہو گیا۔ اُس نے شفقت سے کہا۔

"بیٹھو! بیٹھو!!"

صالح :۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔

خدیجہ:۔ ہاں بیٹے۔ تمہارا گھر ہے جب چاہو آؤ۔

صالح نے دزدیدہ نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا کہ آئندہ آنے جانے کا معرکہ میں نے سر کر لیا۔ پھر مسکرایا اور خدیجہ کو سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ راستہ بھر اُس کے دل میں مسرت و انبساط کی لہریں اُٹھتی رہیں ——— وہ سلمیٰ سے ملتا ہے گا۔

---

(۲۶)

ایک عجیب واقعہ

بعض وقت کچھ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں۔ جن کا پہلے سے سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ صالح کے بارے میں یہ طے ہو گیا تھا۔ کہ جلد از جلد رسم نکاح انجام پا جائے گی۔ اور رخصتی ایک سال بعد ہوگی۔ اگرچہ یہ پابندی صالح کو گراں بہت گزری، لیکن یاس کی تاریکی میں آس کی روشنی نمودار ہوئی۔ یا تو سلمیٰ سے شادی کا ہر امکان ختم ہو گیا تھا، یا کم از کم یہ تو ہوا کہ نکاح کی بات طے پا گئی۔ رہی رخصتی وہ ہوتی رہے گی۔

صالح کے نکاح کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کہ بالکل اچانک سکینہ کی ایک رشتہ دار بہن فاطمہ آئیں فاطمہ اور سکینہ بچپن کے دور میں ساتھ ساتھ کھیل چکی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ دونوں کا ربط

ضبط بڑھتا رہا لیکن پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ سکینہ کی شادی زید کے ساتھ ہوگئی۔ اور وہ اپنے گھر میں آکر بس گئی۔ فاطمہ کی شادی ایک جہاں گرد تاجر عثمان سے ہوگئی۔ اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ ایک شہر سے دوسرے شہر میں چکر لگانے لگی۔ عثمان فاطمہ کو بہت چاہتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی بیوی کا فراق نہیں گوارا کر سکتا تھا۔ دن اسی ہنسی خوشی اور مسرت کے ساتھ بسر ہو رہے ہے۔ کہ سچی بات یہ ہے۔ کہ وہ نہ صرف سکینہ کو بلکہ دنیا اور مافیہا کو بھول گئی۔ عورت کو اگر شوہر کی طرف سے سکھ حاصل ہو۔ تو وہ پھر کچھ نہیں یاد رکھتی اس سکھ میں کھوئی رہتی ہے۔

عثمان اور فاطمہ کی یادگار ایک لڑکی تھی ۔ رملہ ۔ دونوں ماں باپ اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ فدا تھے دونوں اپنی لڑکی پر، اور رملہ تھی بھی عجیب و غریب لڑکی۔ خدا نے حسن صورت تو عطا ہی کیا تھا۔ حسن سیرت سے بھی وہ مالا مال تھی۔ کوئی خوبی ایسی نہیں تھی۔ جو اس میں موجود نہ ہو۔

زمانہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ کاروباری سفر پہ عثمان حسب معمول روانہ ہوا فاطمہ اور رملہ بھی ساتھ تھیں۔ اس مرتبہ عثمان گھر سے نکل کر مغرب اقصیٰ کے شہروں کا چکر کاٹ رہا تھا۔ خوب نفع کمایا۔ مال و دولت کا انبار لیے ہوئے واپس آرہا تھا۔ کہ راستہ میں بیمار پڑا اور تین ہی چار دن کے اندر چٹ پٹ ہو گیا۔ اس حادثہ نے فاطمہ کو نیم جان کر دیا۔ رملہ کی خوشی چھین لی۔ اب تک ان دونوں کا کام ہنسنے اور خوش رہنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اب آنسو بہانے اور رونے کے سوا کوئی مشغلہ نہ رہ گیا

فاطمہ بڑی دوراندیش عورت تھی۔ اس نے حالات کا جائزہ لیا۔ مصر پہنچ کر ساری دولت کو مکانوں اور دوکانوں کو فروخت کیا۔ جن لوگوں کے ذمے رقوم واجب تھیں اُسے ایک ایک پائی وصول کی۔ اور سارا حساب کتاب بند کر کے مرو واپس آئی۔ یہاں اس کا گھر اُجڑ چکا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے بوڑھے اور رشتہ دار بھول چکے تھے۔ لیکن جب وہ دولت کا انبار لے کر واپس آئی تو سب اُس کے گرد منڈلانے لگے۔ لیکن اُس نے کسی کو مُنہ نہیں لگایا سیدھی سکینہ کے پاس پہنچی۔ اور اُسے کہا۔ اپنے کاروبار میں مجھے بھی شریک کر لو۔ یہ اثاثہ جو میرے پاس موجود ہے صرف میرا اور میری بچی کا ہے۔ فاطمہ اگر کنگال ہو کر آئی ہوتی تو بھی سکینہ اس کی پوری مدد کرتی۔ لیکن اب تو وہ لکھ پتی بن کر آئی تھی۔ اس نے حامی بھر لی۔ ابراہیم کو اپنا اور اُس کا سارا ماجرا سُنا کر کہا۔

اب فاطمہ تاعمر ہمارے پاس رہے گی۔ اس کا روپیہ جس کاروبار میں چاہو لگاؤ۔ لیکن اس کا حساب الگ رکھو۔

ابراہیم کو کیا عذر ہو سکتا تھا۔ وہ آمادہ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

مجھے ان کے حالات سُن کر صدمہ ہوا۔ ان کے دُکھ اور غم کو میں پورے طور پر محسوس کرتا ہوں۔ انشاء اللہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے پائے گی۔ رقم اتنی کافی ہے کہ اس سے نہ صرف ان کے مصارف چلیں گے۔ بلکہ ہر سال بہت کافی رقم پس انداز بھی ہو جایا کرے گی۔

ابراہیم یہ کہہ کر چلا گیا۔ پھر سکینہ نے فاطمہ سے کہا۔

"سُنتی ہو بی فاطمہ!

وہ مُسکرا کر بولی۔

"فرمایئے سُن رہی ہوں۔"

سکینہ:۔ اب تم یہاں سے جا نہیں سکتیں۔ تمھیں یہیں رہنا پڑے گا۔

فاطمہ:۔ یعنی اپنے گھر نہ جاؤں۔

سکینہ:۔ ہرگز نہیں۔

فاطمہ:۔ کیوں آخر؟

سکینہ:۔ وہاں کس کے پاس جاؤ گی؟ اتنے بڑے اعلیٰ و دق گھر میں رہتے تمھیں ڈر نہیں لگے گا۔

فاطمہ:۔ ہاں لگتا تو ہے ـــــ خصوصاً رات کو۔

سکینہ:۔ اسی لیے تو کہتی ہوں۔ یہیں رہو (مُسکرا کر) ؎

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

فاطمہ:۔ تجویز تو معقول ہے ـــــ غور کر کے جواب دوں گی۔

سکینہ:۔ غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم نے ہمیشہ میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اب بھی کرنا پڑے گی ـــــ کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ میرے حکم سے سرتابی کر سکو۔

فاطمہ:۔ (مصنوعی طور پر سہم کر) نہیں ـــــ بالکل نہیں۔

سکینہ:۔ بس تو پھر رہو یہیں۔

پھر سکینہ نے رملہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیوں بیٹی تیری کیا رائے ہے؟"

رہلہ واقعی اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی گھبراتی تھی اور یہاں اُسے ایک عجیب قسم کی زندگی اور چہل پہل نظر آ رہی تھی ۔ بے ساختہ اُس کے مُنہ سے نکل گیا ۔

"میں تو یہیں رہوں گی ۔"

فاطمہ نے پوچھا ۔

"چاہے میں رہوں یا نہ رہوں تو یہیں رہے گی ——— کیسی ری بے مروت"

وہ بولی ۔

"آپ کیا نہ رہیں گی ؟"

سکینہ نے فیصلہ کر دیا ۔

بس ——— اب بات آگے نہ بڑھاؤ ۔ میرا کہنا مانو ۔ یہیں رہو ۔ تمھارا مجھ سے

"اور میرا تم سے جی بہلتا رہے گا ۔"

فاطمہ خود اِس تجویز کی دل جان سے مؤید تھی ۔ وہ راضی ہو گئی اور دوسرے روز باقاعدہ سکینہ کے ہاں اُٹھ آئی ۔

رملہ اور یوسف

رملہ کا وجود فوراً سارے گھر پر چھا گیا۔

فاطمہ تو ماں تھی، وہ دل و جان سے چاہتی ہی تھی۔ سکینہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی اماں اپنی اولاد سے کر سکتی ہے۔ ابراہیم اور اُم کلثوم بھی اُسے بہت پسند کرنے لگے۔ اس لیے کہ بڑی شائستہ اطوار اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جو بزرگ، رملہ پر جان دیتے تھے، وہ تھے حضرت یوسف۔

یوسف کی پہلی نگاہ جو رملہ پر پڑی، وہی محبت کی نگاہ بن گئی۔ وہ اُسے دل و جان سے چاہنے لگا۔ وہ گھنٹوں اور پہروں اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اُس کی باتیں سُنا کرتا۔ اُس کے تصوّر میں کھویا رہتا۔ کچھ عجیب حالت ہو گئی۔

تھی اس کی۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

واقعی یوسف کا سینہ سلگنے لگا تھا۔ ہر وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ آگ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

صالح اس راہ کا پرانا راہرو تھا۔ اُس نے یوسف کی کیفیت تاڑ لی ایک روز اُس نے چھیڑا۔

"کیوں حضرت یہ چھپے چھپے چوری چوری؟"

یوسف :۔ کیا ہوا بھئی؟

صالح :۔ کوئی نئی بات تو نہیں؟

یوسف :۔ پھر بھی ۔۔۔!

صالح :۔ تمھاری چوری میں نے پکڑ لی۔

یوسف :۔ تو مجھے جیل بھیج دو۔

صالح :۔ اس کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔ اب تم قید قفس سے بچ نہیں سکتے کسی طرح۔

یوسف :۔ آخر کس خطا پر؟

صالح :۔ پھر بنے ——— ہم سے رازداری نہ برتو۔ بلکہ رازدار بنالو فائدے میں رہو گے۔

یوسف :۔ تم سے بڑھ کر میرا رازدار کون ہو سکتا ہے۔

صالح :۔ پھر بھی چھپایا ـــــ کیوں ؟ ـــــ یہی ہے شرطِ دوستی ؟

یوسف :۔ غلط ـــــ میری زندگی تمھارے سامنے ایک کتاب کی طرح کھلی ہوئی ہے ۔ جہاں سے چاہو پڑھ لو ۔

صالح :۔ پڑھ تو چکا ۔

یوسف :۔ کیا پڑھا تم نے ؟

صالح :۔ یہ کہ تم محبّت کرتے ہو رملہ سے ۔

یوسف چُپ ہو گیا ۔

صالح :۔ میں غلط تو نہیں کہتا ؟

یوسف خاموش رہا ۔

صالح :۔ جواب دو، بتاؤ !

یوسف :۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔

صالح :۔ کیوں ـــــ ؟ سیدھی سی بات ہے ۔ اگر محبّت کرتے ہو تو اقرار کر لو ۔ نہیں کرتے تو انکار کر دو ۔

یوسف :۔ کیا بتاؤں کچھ کہا نہیں جاتا ۔ عجیب حالت ہے دل کی ۔

صالح :۔ بے وقوف اسی کا نام تو محبّت ہے ـــــ بالکل یہی حالت میری تھی ـــــ !

یوسف :۔ اور اب کیا حالت ہے ؟

صالح :۔ خوش ہوں، مسرور ہوں ۔

یوسف :۔ کیا یہ خوشی اور مسرّت مجھے بھی مل سکتی ہے ؟

صالح :۔ کیوں نہیں مل سکتی۔ ضرور ملے گی۔

یوسف :۔ مجھے یقین نہیں۔

صالح :۔ اب پیشہ ور عاشقوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

یوسف :۔ تمھیں میری حالت کا اندازہ نہیں۔

صالح :۔ خوب ہے۔ نہ ہوتا تو چھیڑتا کیوں؟

یوسف :۔ تو پھر کوئی تدبیر نکالو۔

صالح :۔ تدبیر ایک نہیں ہزار دل ہیں۔ لیکن جب تک تم میری باتوں کا
جواب صاف صاف نہیں دو گے، کچھ نہیں ہو سکتا۔

یوسف :۔ میں ہر بات کا جواب دینے کو تیار ہوں۔

صالح :۔ اچھا بتاؤ ——— رملہ سے محبت کرتے ہو نا؟

یوسف :۔ ہاں ——— کرتا ہوں۔

صالح :۔ دل و جان سے۔

یوسف :۔ ہاں دل و جان سے !

صالح :۔ یہ محبت ہوس پر مبنی ہے یا خلوص پر؟

یوسف :۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے اس میں ہوس کا بھی شائبہ ہو۔
لیکن رملہ اتنی خوش اطوار اور نیک سیرت لڑکی ہے۔ کہ اگر آدمی اس سے
نفرت کرتا ہو تو بھی محبت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

صالح :۔ ہاں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ میرا خیال بھی یہی ہے۔

یوسف :۔ دیکھو نا اسے آئے ہوئے ابھی کتنے دن ہوئے۔ لیکن اس قلیل

...یں گھر کا کون آدمی ہے جو اسے نہیں چاہتا۔
...ا۔ ہاں ٹھیک ہے ——— یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس کی
...بڑی اچھی ہے۔
...۔ لیکن میری محبت کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ کرو۔ یہ چٹان کی
...مستحکم ہو گی۔
...۔ اچھا مان لیا۔ اب ایک بات اور بتاؤ۔
...۔ وہ بھی پوچھ لو۔
...۔ کیا رضیہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟
...۔ یہ میں کیا جانوں؟
...۔ جاننا چاہیے تمہیں۔
...۔ میں نہیں جانتا۔ جھوٹ کیوں بولوں۔
...۔ طریقوں سے معلوم کرو۔
...۔ وہ طریقے بھی مجھے نہیں آتے
...۔ میں بتاتا ہوں ——— مثلاً وہ تم سے جب ملتی ہے تو اُس کے چہرے
...بساط کی کیفیت ہوتی ہے یا انقباض کی؟
...۔ انبساط کی؟
...۔ ٹھیک ——— کبھی ملول وافسردہ بیٹھی ہو، اور تم پہنچ جاؤ تو
...خوش ہوتی ہے یا خفا؟
...۔ خفا ہونے کا کیا سوال ہے ——— بارہا ایسا ہوا کہ میں نے اُسے

کسی خیال میں مستغرق دیکھا

صالح :۔ کیا کہا ـــــ کسی خیال میں مُستغرق دیکھا؟

یوسف :۔ ہاں ـــــ اندر میں پہنچ گیا، تو وہ چونک پڑی اور مسکرادی۔
میرا خیر مقدم کیا اور گھُل مل کر باتیں کرنے لگی ۔

صالح :۔ واقعی؟

یوسف :۔ ہاں بھئی ـــ بالکل سچ

صالح :۔ تو بالا مار لیا ہے ـــ وہ تم سے محبّت کرتی ہے ۔

یوسف :۔ یہ لو ـــ تم نے کیسے جانا؟

صالح :۔ ہم نہ جانیں گے تو کون جانے گا ـــــ آدمی پہچانا جاتا ہے۔
قیافہ دیکھ کر ۔

یوسف :۔ ہوگا بھئی ۔ ہم نہیں جانتے ـــــــــ اچھّا اب تو کچھ پوچھنا
نہیں ہے؟

صالح :۔ واہ ابھی کہاں سے

پہلے تم کہاں ہیں نے تو دم لیا ہے ۔
یہ تو بتاؤ وہ خود بھی باتوں میں تم سے پہل کرتی ہے؟

یوسف :۔ کیوں نہیں کرتی ۔

صالح :۔ کبھی تمھیں افسردہ دیکھ کر پریشان ہوتی ہے؟

یوسف :۔ ہاں ہوتی ہے ـــــ کل ہی کی بات ہے میں اُسی کے خیال میں
پریشان و مغموم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا ۔ کہ وہ اُدھر سے گزری ـــ

صالح :۔ خیر یہاں تک تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ——— کہو آگے

یوسف :۔ اور نکل چلی گئی ۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئی ۔

صالح :۔ سچ کہتے ہو؟

یوسف :۔ بیکار باتیں نہ کرو ۔ سُنے جاؤ ——— اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے کمرے میں آگئی

صالح :۔ تمھیں خدا کی قسم! ——— بے جھجک آگئی؟

یوسف :۔ نہیں ——— جھجکتی ہوئی آئی ۔

صالح :۔ پھر تم نے کیا کہا؟

یوسف :۔ کچھ نہیں ——— میں اس کی آمد پر متحیر ہوا ۔ وہ کہنے لگی، بڑی دیر سے آپ اکیلے بیٹھے ہیں یہاں !

صالح :۔ بہت خوب ۔ بہت خوب ———!

یوسف :۔ میں نے کہا ۔ ہاں طبیعت ذرا مضمحل ہے اس وقت ۔ وہ کہنے لگی تو آیئے، باہر چل کر وہاں باغیچہ میں بیٹھیں ۔ وہاں کا سبزہ دیکھ دیکھ کر پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھ کر، چڑیوں کا چہچہانا سُن کر یہ اضمحلال دُور ہو جائے گا ۔

صالح :۔ اب تم شاعری کرنے لگے ۔

یوسف :۔ بکو مت خاموش ——— میں اس کے ساتھ باغیچہ گیا ۔ وہاں سبزے کے فرش پر ہم بیٹھ گئے ۔ اُس نے ایک پھول توڑا اور

صالح :۔ تمھیں دے دیا ۔

یوسف:۔ نہیں ـــــ سونگھنے لگی۔ پھر اُس نے پوچھا۔ آپ کو نغمہ کیفی سے دلچسپی ہے؟ میں نے کہا، ہاں ہے تو۔ کہنے لگی تو کچھ گائیے۔ میں نے کہا، میں گانا بالکل نہیں جانتا۔

صالح:۔ بے وقوف کہیں کا۔

یوسف:۔ گانے لگتا؟

صالح:۔ اللہ کیا ـــــ بڑا عمدہ موقع کھو دیا تم نے۔

یوسف:۔ جی نہیں، بڑا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ سنئے تو ـــ!

صالح:۔ سُن رہا ہوں، بے دلی سے ـــــ اچھا کہو۔

یوسف:۔ وہ کہنے لگی، میں جانتی ہوں گانا۔

صالح:۔ اُفوہ ـــ فرمائش کر دی ہوتی۔

یوسف:۔ کی تو ـــ!

صالح:۔ پھر اُس نے سُنایا؟

یوسف:۔ ہاں ـــ بڑی دیر تک سُناتی رہی۔

صالح:۔ تم سچ کہہ رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو؟

یوسف:۔ تمھیں میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں۔ رملہ کے بارے میں جھوٹ بولنا چاہوں بھی تو بھی نہیں بول سکتا۔

صالح:۔ بہت اچھا جناب ـــ پھر کیا ہوا؟

یوسف:۔ اچھی طرح گانا سُنا چکنے کے بعد اُس نے کہا ـــ کہیئے اب کیا حال ہے؟ ـــــ اضمحلال باقی ہے یا ختم ہو گیا؟ ـــــــ یہ

کہہ کر وہ مسکرائی ـــــ یہ تبسم نہ تھا۔ بجلی تھی۔ جس نے میرے دل کو جلا دیا۔

صالح:۔ وہ تو خیر جلا دیا ہوگا ـــــــ یہ بتاؤ تم نے اُس کے سوال کا جواب دیا؟

یوسف:۔ میں نے کہا، اب اضمحلال کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ اب تو میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔

صالح:۔ پھر اُس نے کیا کہا؟

یوسف:۔ پھر اُس نے کہا، روز یہاں آجایا کیجئے ـــــ میں آپ کو گانا سنایا کروں گی۔

صالح:۔ احمق ـــ پھر بھی تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ تجھ سے محبت نہیں کرتی۔

یوسف:۔ کس طرح سمجھوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

صالح:۔ واقعی اگر اس کی شادی ہوگئی تم سے، تو قسمت پھوٹ جائے گی بیچاری کی۔

یوسف:۔ یہ کیوں؟

صالح:۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ جو تم نہ کہہ سکے وہ کہہ دیتی ـــــــ تم کو جرأت نہ ہوئی کہ اظہارِ عشق کرتے۔ اور وہ لڑکی ہو کر کہہ دیتی میں تم پر جان دیتی ہوں ـــــــ؟

یوسف:۔ یوں نہ کہتی۔ دوسرے الفاظ میں کہہ دیتی۔

صالح:۔ کیا غرض پڑی تھی اُسے ـــــــ کیوں کہہ دیتی ـــــــ تم نے کیوں نہیں کہا؟

یوسف :۔ اس کے ڈر سے !

صالح :۔ ڈرتے بھی ہو اُس سے؟

یوسف :۔ ہاں ۔ بہت زیادہ ـــــ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہیں میری کوئی بات اسے ناگوار نہ گزرے ۔ وہ خفا نہ ہو جائے ۔

صالح :۔ اچھا بکواس بند کرو ـــــ پھر تم نے کیا کہا ؟

یوسف :۔ میں نے کہا ، سر آنکھوں پر ، آیا کروں گا ۔

صالح :۔ پھر وہ کیا بولی ؟

یوسف :۔ مسکرانے لگی ۔

صالح :۔ بھئی قسم لے لو ہم سے ، وہ تمھیں چاہتی ہے ۔

یوسف :۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ـــــ لیکن فرض کرو محبت بھی کرتی ہے ۔ پھر ـــــ ؟

صالح : پھر کا کیا مطلب ؟

یوسف :۔ گاڑی آگے کیسے چلے گی ؟ ـــــ یہ بتاؤ ؟

صالح :۔ (چھیڑتے ہوئے) گاڑی کے آگے چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے ـــــ ؟ کیا اتنا کافی نہیں کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے ۔ اور تم اُسے چاہتے ہو ۔

یوسف :۔ پھر تم نے بھی اس بات پر کیوں قناعت نہیں کر لی ـــــ ؟

صالح :۔ (ہنس کر) اچھا بھئی اچھا ـــــ مطلب یہ کہ شادی ہونی چاہیے

یوسف :۔ ہاں اور کیا ـــــ اگر شادی کی سبیل نہ نکلی تو پھر ـــــ

صالح :۔ پھر کیا ـــــ ؟ خودکشی کر لوگے ؟

یوسف :۔ میں دھوکا نہیں دیتا، لیکن کہے دیتا ہوں تم مجھے آئندہ نہیں پاؤ گے
یہ سُنکر صالح سہم گیا۔ اُس نے کہا ۔
"یوسف ——— !"
یوسف :۔ ہاں صالح، میں غلط نہیں کہتا۔ میں بہت زیادہ چاہنے لگا ہوں
رملہ کو ——— وہ میری زندگی بن چکی ہے ۔
صالح :۔ گھبراؤ نہیں، انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ ——— جب
تک میں زندہ ہوں تمھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک سوال
بڑا نازک پیدا ہو گیا ہے ۔
یوسف :۔ کون سا سوال ؟
صالح :۔ تم نے کبھی بتایا تھا کسی اور جگہ تمھاری شادی کی بات چیت ہو چکی
ہے ——— !
یوسف :۔ ہاں ——— تو ؟
صالح :۔ وہاں کا کیا ہو گا ؟
یوسف :۔ انکار ——— بالکل صاف و صریح
صالح :۔ لیکن ———
یوسف :۔ لیکن ویکن کچھ نہیں ——— پہلے میں کسی سے محبت نہیں کرتا تھا
جس سے شادی کر دی جاتی کر لیتا۔ اب محبت کرتا ہوں۔ اب رملہ کے سوا
کسی کو رفیقۂ حیات نہیں بنا سکتا ۔
صالح :۔ یہ اٹل فیصلہ ہے تمھارا ؟ ——— کیوں ؟

یوسف :۔ ہاں بالکل اٹل۔

صالح :۔ میں آج ہی چچی جان سے اس مسئلہ کو چھیڑتا ہوں جاکر

یوسف :۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔

صالح :۔ کون سی بات سوچی ہے جناب نے؟

یوسف :۔ اماں سے یہ ذکر اس طرح چھیڑنا کہ انھیں ناگوار نہ گزرے۔ اگر انھوں نے انکار کر دیا۔ تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

صالح :۔ بھائی میں تمھاری طرح بے وقف نہیں ہوں۔ موقع محل دیکھ کر بات کروں گا۔ اور اپنی طرف سے کہوں گا۔ جو کچھ کہنا ہے۔ تمھارا کہیں ذکر بھی نہیں آنے پائے گا۔

یوسف :۔ شاباش ـــــ میں بھی یہی چاہتا ہوں ـــــ!

---

(۲۸)

نیا فیصلہ

صالح نے یوسف کی باتوں سے اندازہ لگا لیا۔ کہ وہ واقعی رملہ کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ اُس نے طے کر لیا کہ اس مہم کو سر کر کے رہے گا اُسے امید تھی کہ کامیاب ہو گا اس لیے کہ سکینہ اُسے بہت چاہتی تھی۔ اور اسی چاہت نے اُسے کسی حد تک گستاخ بھی کر دیا تھا۔

کرم ہائے تو مارا کہ دگستاخ

شام ہونے کے بعد وہ سیدھا سکینہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر نماز عشا کی تیاریاں کر رہی تھی۔ صالح کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کیوں بیٹا کچھ کام ہے مجھ سے؟"

وہ بولا۔

"چچی کوئی کام تو نہیں۔ یوں ہی آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

سکینہ :۔ تو آ دبیٹھو۔

وہ آکر ادب سے بیٹھ گیا۔

سکینہ :۔ اب تو تم بہت خوش ہوگے؟ ——— کیوں؟

صالح :۔ (ذرا شرماتے ہوئے) جی ——— یہ سب آپ ہی کی محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے ——— چچی جان ایک بات تو بتایئے؟

سکینہ :۔ پوچھو بیٹے کیا بات ہے ———؟

صالح :۔ یہ جو آئی ہیں آپ کے پاس یہ کون ہیں؟

سکینہ :۔ کون فاطمہ ———؟

صالح :۔ جی وہی۔

سکینہ :۔ میری بچپن کی سہیلی اور دوست ہیں۔

صالح :۔ بڑی اچھی بی بی ہیں۔

سکینہ :۔ ہاں بہت زیادہ ——— اتنی نیک اور شریف عورت مشکل سے ملے گی

صالح :۔ جی ہاں ——— ہر شخص تعریف کرتا ہے۔

سکینہ :۔ اب وہ یہیں رہیں گی۔

صالح :۔ جی۔ میں سُن چکا ہوں۔ یہ بہت اچھا ہوا ——— اور اُن کی لڑکی رملہ؟

سکینہ :۔ وہ بھی رہے گی ——— کتنی اچھی لڑکی ہے۔

صالح :— جی بہت زیادہ

سکینہ :— کوئی گُن ایسا نہیں جو اُس میں موجود نہ ہو۔

صالح :— جی ہاں سب ہی کچھ ہیں۔

سکینہ :— ہر کام میں طاق۔

صالح :— اور کیا ——!

سکینہ :— اتنی پیاری لڑکی ہے کہ اُسے اولاد کی طرح چاہنے لگی ہوں۔

صالح :— جی کیوں نہیں —— اور میں تو دیکھتا ہوں، وہ بھی آپ کا بہت خیال رکھتی ہے۔

سکینہ :— ہاں بیٹا بہت زیادہ —— میرا بستر وہی کرتی ہے۔ کھانے وقت آکر پاس بیٹھ جاتی ہے۔ کسی کام کے لیے اٹھوں کیا مجال ہے جو قدم اُٹھنے دے۔ خود ہی دوڑ کر دے گی۔ وہ کام۔

صالح :— کیا کوئی لڑکی یا بہو بھی ایسی محبت کرے گی؟

سکینہ :— لڑکی اور بہو —— ؟ دونوں سے اچھی ہے۔

صالح :— اس میں کیا شک ہے —— آپ کی باتوں سے مجھے کچھ شُبہ ہوتا ہے چچی جان!

سکینہ :— کیسا شُبہ بیٹے؟

صالح :— آپ نے شاید رملہ سے یوسف کی شادی کرنے کا تہیہ کر لیا ہے —— معلوم نہیں یوسف کو بھی یہ رشتہ پسند ہوگا یا نہیں؟

سکینہ :— تو یوں کہیں نہیں کہتا کہ یوسف نے انکار کر دیا ہے۔ اور تو اُس کا

یہ پیام لے کر آیا ہے ——— لیکن میں سکینہ ہوں، میرا فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا۔

صالح :— بے شک ——— میں کیا گھر جانتا ہے

سکینہ :— تو پھر یوسف کو بتا دو، رملہ سے اچھی لڑکی نہیں مل سکتی۔ اُسے رملہ ہی سے شادی کرنا پڑے گی۔

صالح :— جی میں بڑے شوق سے کہہ دوں گا۔ کیا مجال ہے۔ یوسف کی جو انکار کر سکے ——— رملہ جیسی خوب صورت اور خوب سیرت لڑکی سے شادی کرنا فخر کا سبب ہے۔

سکینہ :— بے شک۔

صالح :— لیکن چچی جان اُن کی بات کہیں اور ٹھیرائی تھی شاید آپ نے؟

سکینہ :— اُونہہ ہوگا۔

صالح :— جی ہاں ہوگا ——— مجھ سے یوسف ایک دفعہ کہہ رہے تھے۔

سکینہ :— (چونک کر) کیا کہہ رہا تھا یوسف؟

صالح :— یہی کہ آپ نے ان کی بات کہیں ٹھیرائی ہے۔

سکینہ :— اور وہ خوش تھا۔؟

صالح :— جی بہت زیادہ۔

سکینہ :— احمق بے وقوف

صالح :— بے شک

سکینہ :— کہاں رملہ کہاں وہ؟

صالح :— جی

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

سکینہ :— اور کیا ——— ؟ حالانکہ نہ وہ میری عزیز قریب ہے۔ لیکن ایمان کی کہوں گی، رملہ کی بات ہی دوسری ہے۔

صالح :— میں تو ایک بات جانتا ہوں چچی جان

سکینہ :— کیا بیٹے ؟

صالح :— یہ کہ ماں سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں، ماں کی رائے سے بڑھ کر کسی کی رائے نہیں۔ ماں کے حکم سے بڑھ کر کسی کا حکم واجب التعمیل نہیں۔

سکینہ :— خدا خوش رکھے تم کو۔ ہر سعادت مند لڑکے کو یہی سمجھنا چاہیے۔

صالح :— بلاشبہ

سکینہ :— تمھارے دوست کا کیا خیال ہے ——— مٹے ہوئے ہیں اپنی پہلی منگیتر پر ؟

صالح :— جی نہیں، مٹے تو کیا ہیں ——— لیکن یہ ضرور ہے کہ ———

سکینہ :— بس آگے نہ کہنا کچھ۔

صالح :— بہت اچھا۔

سکینہ :— اور یوسف کو سمجھا دو کہ اُسے رملہ ہی سے شادی کرنی ہے۔

صالح :— ضرور سمجھا دوں گا۔

سکینہ :۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ۔

صالح :۔ کون سی بات چچی جان ؟

سکینہ :۔ ویسے تو یوسف رملہ سے بڑی اچھی طرح ملتا ہے ۔ اس سے باتیں کرتا ہے ۔ اُس کے پاس اُٹھتا بیٹھتا ہے ——— پھر کیوں اس سے نفرت کرتا ہے ۔ ؟ یہ کیا ہے آخر ؟

صالح :۔ جی نہیں ۔ نفرت کہتے ۔ نفرت کیا کریں گے ! محبت بھی نہیں کرتے شاید آگے چل کر کرنے لگیں ۔

سکینہ :۔ وہ تو کرتا ہی پڑے گی ۔ کیسے نہیں کرے گا ۔

صالح :۔ میرا تو خیال ہے کہ رملہ میں اتنی خوبیاں ہیں کہ وہ خود محبت کرنے پر مجبور کر دیں گی اُنھیں

سکینہ :۔ ہاں شادی کے بعد آدمی محبت کرنے ہی لگتا ہے ۔

صالح :۔ لیکن میری ایک رائے ہے چچی جان !

سکینہ :۔ کس بارے میں ؟

صالح :۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ موقعہ اچھا ہے ۔

سکینہ :۔ کون سا موقعہ ؟

صالح :۔ چند روز بعد یہاں گھر میں تقریب ہونے والی ہے ۔

سکینہ :۔ ہاں ۔ انشاء اللہ تیری شادی ہوگی ۔

صالح :۔ اسی موقعہ پر ———

سکینہ :۔ یوسف کی شادی رملہ سے کر دوں ؟

صالح :۔ جی ——— کیا مضائقہ ہے اس میں ؟
سکینہ :۔ مضائقہ تو کچھ نہیں ، بلکہ سچ پوچھو تو تجویز بڑی معقول ہے ۔
صالح :۔ وہ تو ہی ہے ۔
سکینہ :۔ لیکن فاطمہ بہن ——— ؟
صالح :۔ وہ آپ کی رائے سے کیسے سرتابی کرسکتی ہیں ۔ پھر اُنھیں یوسف سے اچھّا داماد دنیا میں نہیں ملے گا ۔
سکینہ :۔ ہاں یہ تو ہے لیکن رملہ کا عندیہ بھی تو لے لینا چاہیے ——— میں یہ نہیں چاہتی کہ اُس کی مرضی کے خلاف ———
صالح :۔ نہیں چچی ، ایسا نہیں ہے ۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ رملہ یوسف کو پسند کرتی ہے ۔
سکینہ :۔ کیا بک رہا ہے لڑکے ——— تو نے کیسے جانا ؟ ——— کہیں کسی اور کے سامنے نہ بک دیجو ۔
صالح :۔ نہیں نہیں ۔ ایسا نہیں کروں گا ——— لیکن غور فرمائیے وہ یوسف سے ، اُس کی باتوں سے ، اس کی مجلس سے کتنی دلچسپی لیتی ہے ؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ اُسے پسند کرتی ہے ؟ ———
سکینہ :۔ (غور کرتے ہوئے) ہاں کہنا تو ٹھیک ہے ——— خدا کی قسم وہ یوسف کی زندگی سنوار دے گی ۔
صالح :۔ بے شک ——— اس میں کیا شُبہ ہے ۔
سکینہ :۔ تو بیٹا ایک کام کرو ۔

صالح :۔ فرمایئے ـــــ ہر کام کے لیے بجان و دل حاضر ہوں۔

سکینہ :۔ ذرا یوسف کا عندیہ لے لو تاکہ میں بے دھڑک فاطمہ کو پیام دے سکوں

صالح :۔ آپ بے دھڑک پیام دیجئے۔ یوسف کے عندیہ کا کیا ہے۔ میں پوچھ لوں گا۔ لیکن وہ انکار نہیں کر سکتا۔

سکینہ :۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ میں رملہ کو اولاد کی طرح چاہتی ہوں۔ لہٰذا رضامندی کی شادی کر کے اس کی زندگی کرنا نہیں چاہتی ـــ بس یہ بات ہے۔ تو باتوں باتوں میں اس کی رائے لے لے

صالح :۔ لے لوں گا

سکینہ :۔ لیکن کب ـــــ؟

صالح :۔ بہت جلد ـــ بلکہ کل ہی

سکینہ :۔ ہاں۔ اس لیے کہ اگر بات بن جائے تو لگے میں لگ تیرے ساتھ ساتھ اس کی رسم شادی بھی انجام پا جائے۔

صالح :۔ یہ بڑا اچھا ہوگا۔ بس اس فیصلہ پہ قائم رہیے۔

سکینہ :۔ انشاء اللہ یہی ہوگا۔ بہرکیف پہلے تو یوسف سے پوچھ دیکھو۔

صالح :۔ بہت خوب ـــــ کل سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔

---

(۲۹)

مرحلۂ شوق

شادی سے صرف دو روز پہلے سلمیٰ کا باپ جمال سخت بیمار ہوگیا۔ مجبوراً شادی ملتوی کرنی پڑی۔ اس التوا کا صدمہ یوں تو سب ہی کو تھا۔ لیکن صالح کو صدمہ بھی تھا۔ اور غصہ بھی ——— صدمہ اپنی محرومی پر، اور غصہ جمال کی علالت پر۔ اُس کا بس چلتا تو اس بے موقع بیماری کو ختم کر دیتا۔ لیکن موت اور بیماری پر بس کس کا چلا ہے۔ آخر صبر کر کے خاموش ہوگیا۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ کہ خدا جمال کو جلد اچھا کر دے۔

عجیب لُطف انگریز مصیبت یہ تھی۔ کہ صالح نے یوسف کی شادی کے لیے جو تدبیر کی تھی وہ ضرورت سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ سکینہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ کہ واقعی رملہ سے اچھی بہو نہیں مل سکتی۔ کون سی خوبی ہے جو اس میں

نہیں ۔ اگر وہ اس گھر میں آگئی تو رونق دو بالا ہو جائے گی ۔ اب وہ اُسے بھول چکی تھیں ۔ کہ یوسف کی کہیں اور بھی بات چیت ٹھہر چکی ہے ۔ اب وہاں کیا کیا جائے گا ۔ اور معاملہ کس طرح رفع کیا جائے گا ؟ صرف ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح وہ رملہ بیاہ لائیں ۔

زمانہ کے نشیب فراز نے سکینہ کو دور اندیش بنا دیا تھا ۔ قبل اس کے کہ وہ فاطمہ سے اس مسئلہ کا آخری فیصلہ کریں ۔ مناسب سمجھا کہ یوسف کا دل بھی ٹٹول لیا جائے ۔ ان بیچاری کو کیا معلوم ، یوسف پہلے ہی رملہ کو دل دے چکا تھا ۔ اُسے اپنانے میں ہر قربانی پہ آمادہ ہے ! ——— حتیٰ کہ اپنی جان کی بھی !

ایک روز سکینہ نے یوسف کو اپنے پاس بلایا ، اُس وقت بالکل تنہائی تھی ۔ یوسف آیا اور ادب کے ساتھ خاموش ہو کر بیٹھ گیا ۔

سکینہ :۔ یوسف میں آج تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں ۔

یوسف :۔ آپ میری ماں ہیں ۔ اور ماں بھی کیسی کہ دنیا میں ایسی ماں مشکل سے ملے گی ۔ آپ جو کہیں گی ۔ میں غور سے سُنوں گا ۔ اور دل و جان سے ان پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا !!

سکینہ :۔ لڑکے زیادہ باتیں نہ بنا ——— جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دے ۔ ——— فاطمہ کے بارے میں تیری کیا رائے ہے ؟

یوسف اس عجیب و غریب سوال پر سہم سا گیا ۔ وہ سمجھ رہا تھا امّاں جان اب رملہ کا ذکر چھیڑیں گی ۔ پھر مجھے حکم دیں گی کہ میں اُس سے شادی کر لوں ۔ میں جھوٹ موٹ انکار کروں گا ۔ پھر راضی ہو جاؤں گا ۔ لیکن وہ تو رملہ کی بجائے رملہ کی ماں کا

ذکر چھیڑ رہی ہیں ؟ کیا صالح نے شرارت کہہ کے اماں کو فاطمہ سے میری شادی کرنے پر رضامند کیا ہے ؟ میرا ان کا کیا جوڑ ؟ میں ان کی اولاد کے برابر ہوں لاحول ولاقوۃ ، یہ کیسا عجیب سوال ہے ۔ میں اس کا جواب کیا دوں ؟

اتنے میں سکینہ نے کہا ۔

میں نے ابھی تجھ سے کچھ پوچھا تھا ؟

یوسف :۔ جی ——— فاطمہ کے بارے میں ؟

سکینہ :۔ بدتمیز ——— فاطمہ کو خالی فاطمہ کہتا ہے ۔ فاطمہ خالہ کہے گا تو زبان گھس جائے گی ۔ عجیب لڑکا ہے ۔ نہ بزرگوں کا ادب ، نہ بڑوں کا لحاظ !

اب یوسف کی جان میں جان آئی ۔ وہ مسکرایا ۔ اُس نے کہا ۔

"اچھا فاطمہ خالہ سہی ——— کیا ہوا اُنھیں ؟

سکینہ :۔ ارے واہ رے لڑکے ، خدا نہ کرے اُنھیں کچھ ہو ۔ میں پوچھ رہی ہوں ان کے بارے میں تیری رائے کیا ہے ؟

یوسف :۔ چھوٹوں کو کیا حق ہے کہ وہ بزرگوں پر رائے زنی کریں ۔

سکینہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا ۔

"شاباش ! ——— اچھا اُن کو چھوڑ ، رملہ کے بارے میں بتا ؟

یوسف :۔ (دل ہی دل میں خوش ہو کر) وہ فاطمہ خالہ کی لڑکی ہے ۔

سکینہ :۔ پھر وہی شرارت ! یہ تو میں بھی جانتی ہوں اُن کی لڑکی ہے ——— لیکن ہے کیسی ؟

یوسف :۔ بظاہر تو نیک معلوم ہوتی ہے ۔

سکینہ: ـ صرف بظاہر ـــــ ویسے بڑی شریر ہے ـــ کیوں؟

یوسف: ـ امّاں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا ـــــــ نہیں واقعی وہ بہت اچھّی لڑکی ہے ۔

سکینہ: ـ تو اُسے پسند کرتا ہے؟

یوسف: ـ کہہ تو رہا ہوں اچھّی لڑکی ہے!

سکینہ: ـ اچھّی بُری کو مجھ پر چھوڑ ـ تو اسے پسند کرتا ہے یا نہیں؟ یہ بتا!

یوسف نے سوچا کہیں معاملہ اُلٹا ہی نہ ہو جائے ـ اس نے کہا ۔

ہاں ـــــ پسند کرتا ہوں!

سکینہ: ـ اگر میں اُسے اپنی بہو بنانا چاہوں تو ـــ؟

یوسف: ـ تو کیا ـــــ! آپ کے فیصلہ میں مداخلت کی جرأت کہاں سے لاؤں گا؟ میرا فرض ہے کہ آپ کے ارشاد پہلے چون وچرا گردن جھکا دوں"

اتنے میں کسی کام سے فاطمہ کا اُدھر گزر ہوا ۔ وہ ماں بیٹے کو تخلیہ میں باتیں کرتے دیکھ کر اُلٹے پاؤں واپس ہوئیں ۔ سکینہ نے روک لیا ۔

سکینہ: ـ ارے واہ! کہاں چلیں ـــ؟

فاطمہ: ـ پھر آجاؤں گی ۔

سکینہ: ـ آؤ بیٹھو ـــ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے ۔

فاطمہ بیچاری آکر بیٹھ گئیں ۔

سکینہ: ـ دیکھو یہ ہے میرا بیٹا یوسف ـــــ میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا سرور ـــ!

فاطمہ :۔ خدا جیتا رکھے ـــــ کیا میں جانتی نہیں۔

سکینہ :۔ اُسے دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ یہ میری زندگی بن چکا ہے

فاطمہ :۔ وہ بھی تم سے کتنی محبّت کرتا ہے خدا ایسی اولاد سب کو دے۔

سکینہ :۔ میری ایک خواہش ہے ـــــــــــــ

فاطمہ :۔ خدا تمھاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ اُس پہ بھروسہ رکھو۔

سکینہ :۔ ہاں جانتی ہوں سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس خواہش کا بڑی حد تک تم سے تعلق ہے

فاطمہ :۔ تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمھارے کہنے سے باہر ہوں؟

سکینہ :۔ میں چاہتی ہوں میرے بچّے کو تم اپنا بیٹا بنالو۔

فاطمہ :۔ بنا کیا لوں۔ وہ تو ہے ہی۔ میرا بیٹا۔ اس میں اور رملہ میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا۔

سکینہ :۔ ہاں وہ تو ہونا ہی چاہیے۔

فاطمہ :۔ بس تو پھر اس میں کہنے سُننے کی کیا بات تھی۔ ؟

سکینہ :۔ تم مجھ سے کہو کہ میں رملہ کو اپنی بیٹی بنالوں۔

فاطمہ :۔ میں کہوں، تب بناؤ گی؟

سکینہ :۔ نہیں، بنا تو چکی ہو۔ پھر میرا دل مضبوط ہو جائے گا۔

فاطمہ :۔ اب کمزور کیوں ہے؟

سکینہ :۔ ہمیشہ کا کمزور ہے۔

فاطمہ کو ہنسی آگئی۔ پھر اُس نے کہا۔

فاطمہ :۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟

سکینہ :۔ یہ کہ رملہ اس گھر کی مالک بن کر ہمیشہ یہیں رہے ۔ میں اُسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں ۔

فاطمہ :۔ اوہو ۔ اتنی سی بات کے لیے اتنی بڑی تمہید ۔ پہلے ہی کہہ دیا ہوتا ۔

سکینہ :۔ تو گویا تمہیں میری یہ استدعا منظور ہے

فاطمہ :۔ نامنظور ہونے کی وجہ؟ رملہ اور یوسف دونوں میری دونوں آنکھیں ہیں ۔

سکینہ :۔ تمہاری ہی نہیں میری بھی ۔

فاطمہ :۔ اطمینان رکھو ۔ انشاءاللہ وہی ہوگا جو تم نے کہا ہے ۔

سکینہ :۔ لیکن کب؟

فاطمہ :۔ بہت جلد ۔

سکینہ :۔ میں کچھ نہیں جانتی ۔ زیادہ سے زیادہ ہفتہ عشرہ میں یہ تقریب انجام پا جانی چاہیے ۔

فاطمہ :۔ بہن اتنی جلدی بھی ٹھیک نہیں ۔ ذرا تو مُہلت دو ۔

سکینہ :۔ مہلت کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں غیریت ہو ۔ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو ۔ میں تم سے خوب واقف ہوں ۔ تمہیں میرے متعلق غلط فہمی نہیں ہو سکتی ۔ مجھے تمہارے خلاف کوئی نہیں بھڑکا سکتا ۔ جس طرح ہم دونوں کے دل ملے ہوتے ہیں اُسی طرح خدا نے رُوحیں بھی ملا دی ہیں ۔ لہٰذا نہ مجھے کچھ دیکھنا سُننا ہے نہ تمہیں ۔ خدا کا نام لو اور بسم اللہ کر دو ۔

فاطمہ :۔ وہ تو ٹھیک ہے ، لیکن کچھ مشکلیں بھی تو ہیں ۔ اُن پر بھی تو غالب آنا ہے

سکینہ :۔ مشکلیں کیسی؟

فاطمہ :۔ ایک رشتہ دار ہیں۔ ان کے بیٹوں رشتہ کی بات چیت شروع ہو چکی تھی اس کے باپ کی زندگی ہی ہیں۔

سکینہ :۔ یوسف کے ساتھ بھی تو مشکل ہے۔ لیکن جس طرح میں حوصلہ سے کام لے رہی ہوں، تم بھی لو۔

فاطمہ :۔ یوں یکایک بیاہ کر دینے سے لوگ بدنام کر دیں گے۔

سکینہ :۔ ہم بدنامی کی پروا نہیں کرتے —— سمجھیں؟

فاطمہ :۔ وہ تو سمجھ لیا۔ لیکن خلق خدا کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔

سکینہ :۔ بڑی آئی خلق خدا والی —— کیا کہے گی خلق خدا؟

فاطمہ :۔ یہ کہ دولت مند گھرانا دیکھ کر لڑکی بیاہ دی۔

سکینہ :۔ ہیں ہی دولت مند ہوں —— ؟ خدا کے فضل سے تم کوئی کم ہو کسی سے انیس بیس کا فرق بھی کوئی فرق ہے؟

فاطمہ :۔ ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ کہہ دیا —— جو تم چاہتی ہو وہی ہوگا۔ لیکن ذرا چھری تلے دم تو لینے دو۔

سکینہ :۔ اچھا تو ایک بات طے کر لو —— زیادہ سے زیادہ تین مہینے کے اندر اندر جو کچھ کرنا ہو کر لو۔ اس کے بعد ایک دن کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔

فاطمہ :۔ (آمادگی کے ساتھ) منظور —— یہ مدت بالکل کافی ہے سارے انتظامات بھی مکمل ہو جائیں گے۔ اور دشواریاں بھی دور ہو جائیں گی پھر انشاء اللہ بے غل و غش یہ رسم انجام پا جائے گی۔"

یوسف دل میں خوشی کے شادیانے بجاتا رہا۔ اور بظاہر چپ چاپ یہ باتیں سنتا رہا۔

کی جا سکتی ہے۔

یوسف:۔ میں عشق کی لذت سے ناواقف ہوں؟

صالح:۔ ہاں بالکل!

یوسف:۔ اور دلہ سے عشق کون فرما رہا ہے جناب؟

صالح:۔ اسے عشق نہیں کہتے۔

یوسف:۔ پھر کیا کہتے ہیں؟

صالح:۔ یہ تو صرف ابتدائے عشق ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

یوسف:۔ (ہنس کر) واقعی تمھارا دماغ چل گیا ہے ——— ؟ میں تو نہیں رہا خوش ہوں، مسرور ہوں، نہ فکر نہ غم۔

صالح:۔ پھر بھی عاشق ہو؟

یوسف:۔ بیشک ——— عاشق ہوں اور کھرا عاشق ہوں۔ تمھاری طرح تھوڑی کہ ہر وقت مُنہ بسورے رہتے ہیں کیا ہوا بھئی؟ عشق سوار ہے سر پر ———!

صالح:۔ کاش تم جانتے فراق کیا ہے؟

یوسف:۔ جب فراق ہے نہیں جانوں کیوں؟

صالح:۔ لیکن میں تو اس بوجھ کے تلے دبا جا رہا ہوں۔

یوسف:۔ غمِ فراق کا بوجھ؟

صالح:۔ ہاں جسے تم حضور کہتے ہو وہ میرے نزدیک غیاب ہے ———

خوب کہا ہے ایک شاعر نے بخدا بالکل میرے دل کی بات، میرے ہی نہیں ہر عاشق صادق کے دل کی بات ——————

یوسف :۔ تعریف کر بھی چکو کسی طرح، وہ شعر کیا ہے حضرت؟

صالح :۔ بڑا عمدہ شعر ہے، کہا ہے، اور خوب کہا ہے ظالم نے!

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نظر کامیاب ہے

دل کی تسلی صرف دید ہی سے نہیں ہوتی۔

یوسف :۔ بھئی میرے سر میں درد ہونے لگا بہت سُن لیا تمہارا فلسفہ، اب معاف کرو۔

صالح :۔ جاؤ۔ ہنسو کھیلو، کودو، مزے کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم اور مسرت، میں ہوں اور غم بے نہایت!

یوسف :۔ (زچ آکر) خدا کے لیے یہ یاس و قنوط کی باتیں چھوڑو جی گھبرا رہا ہو تو جاؤ تھوڑی دیر کے لیے سلمیٰ سے مل آؤ۔

صالح :۔ اس سے ملوں گا۔ باتیں کروں گا۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ لیکن یہاں واپس آنے کے بعد پھر محرومی کا صدمہ جان پر بنا دے گا۔

یوسف :۔ لہٰذا اب اُس سے ملنا چھوڑ دو گے؟

صالح :۔ نہیں۔ یہ بھی نہیں کر سکتا۔

یوسف :۔ پھر آخر کیا کرو گے ——————؟ لاحول ولا قوۃ، کیا کئے آیا تھا اور کس چکر میں پھنس گیا۔

صالح :۔ کیا کہنے آئے تھے کہو۔ میرا دل رو رہا ہے۔ لیکن صرف تمہاری ہی خاطر

سُن رہے ہیں

یوسف :۔ شکریہ اس بندہ نوازی کا۔ لیکن جب تک آپ سلمٰی سے زبل کرئیں اور
آدمیت کا جامہ نہ پہن لیں، میں کسی قسم کی گفتگو نہیں کروں گا یاد رکھو۔

صالح :۔ عشق جنون پیشہ نے مجھ سے آدمیت کا جامہ چھین لیا ہے۔ وہ اب ہی
دن زیب بر ہوگا، جب سلمٰی میری ہو جائے گی۔

یوسف :۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک سلمٰی تمھاری نہ ہو جائے، تم یہ گفتگو
کر کے وقت ضائع کرنا ہے۔

صالح :۔ خدا کے بندے، کچھ کہو تو؟

یوسف :۔ کیا کہوں، تم نے طبیعت مکدّر کر دی۔ کوئی اتنا بھی سواس باختہ نہ
ہوگا۔ حالانکہ میں بڑی اچھی خبر لے کر آیا تھا۔ لیکن تم سنو بھی۔ کہتے بھی دو۔
اب جاتا ہوں پھر کسی وقت ملوں گا!

یوں یہ کہہ کر اٹھا۔ لیکن صالح نے اُس کا دامن پکڑ لیا۔

صالح :۔ نہیں۔ تم نہیں جا سکتے۔

یوسف :۔ اچھا بیٹھا جاتا ہوں۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہوں گا۔

صالح :۔ نہیں ۔ وہ تو بتانی پڑے گی۔

یوسف :۔ تو وعدہ کرو۔ کہ آدمیت میں رہوگے؟

صالح :۔ وعدہ کرتا ہوں۔

پھر یوسف نے سکینہ اور فاطمہ کی ساری گفتگو اُسے سُنا دی۔ اور کہا
اب میں تم سے ہمدردی کرتا ہوں۔ تم مجھے مبارک باد دو۔

صالح :- ہاں میں صدق دل سے اس کامیابی پر تمھیں مبارک باد دیتا ہوں۔ خواہ تم میرے ساتھ ہمدردی کرو یا نہ کرو۔ تمھاری خوشی کو میں اپنی خوشی پر ترجیح دیتا ہوں۔

یوسف :- اس ایثار کی ضرورت نہیں ——— اس خبر میں ہیو قوفوں کے لیے ایک سبق بھی ہے۔

صالح :- کون سا سبق ؟

یوسف :- تم سُن چکے کہ میری شادی تین مہینے بعد رملہ کے ساتھ ہوگی۔ اس مدت میں اگر اضافہ نہیں ہو سکتا تو کمی بھی نہیں ہو سکتی۔

صالح :- ہاں ٹھیک ہے۔

یوسف :- اور تمھاری شادی صرف جمال چچا کی صحت پر منحصر ہے۔ وہ آج اچھے ہو جائیں تو کل شادی ہو جانے گی۔

صالح :- یہ بھی درست

یوسف :- اب بتاؤ مضطرب مجھے ہونا چاہیے یا تمھیں ؟ ——— حالانکہ یقین کرو، میں رملہ کو اتنا ہی چاہتا ہوں جتنا تم سلمیٰ کو۔ میرے لیے بھی رملہ کا فراق اتنا ہی جاں گسل ہے جتنا تمھارے لیے سلمیٰ کا۔ جس طرح سلمیٰ تمھارے دل و دماغ پر چھا چکی ہے۔ اُسی طرح رملہ میرے دل و دماغ پر حکومت کر رہی ہے۔ لیکن میں صبر سے کام لیتا ہوں، اور تم دامن صبر کو ذرا ذرا سی بات میں تار تار کرنے لگتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے!

صالح :- ہاں، تمھاری اس گفتگو سے مجھے تسلی ہوئی۔

یوسف :- پھر اب تو اضطراب و اضطرار کا اظہار نہیں کرو گے ؟

صالح :۔ کوشش کروں گا۔ دُعا کرو خدا مجھے کامیاب کرے۔

یوسف :۔ واقعی تمھاری حالت بہت بگڑ چکی ہے۔ خدا رحم کرے اچھا میں تم سے ایک عہد کرتا ہوں۔

صالح :۔ کس قسم کا عہد کرتا ہوں۔

یوسف :۔ جب تک سلمیٰ سے تمھاری شادی نہ ہو جائے میں بھی رملہ سے شادی نہیں کروں گا۔ خواہ تین مہینے نہیں تین برس انتظار کرنا پڑے ـــــ کیا سمجھے؟

صالح :۔ سمجھ گیا ـــــ لیکن اتنے بڑے عہد کی کیا ضرورت ہے؟

یوسف :۔ میں تمھیں سرگشتہ اور پریشان نہیں دیکھ سکتا رملہ سے شادی کا مسئلہ طے ہونے کے بعد مجھے جتنی خوشی ہوئی تھی، تمھیں مضمحل اور پریشان دیکھ کر اتنی ہی تکلیف ہوئی۔ ساری خوشی کافور ہو گئی۔ اور دل خون کے آنسو رونے لگا۔ میں دنیا کی ہر بات برداشت کر سکتا ہوں لیکن صالح کو ملول و افسردہ نہیں دیکھ سکتا۔

صالح :۔ (مسکرا کر) گویا حضور صالح کو رملہ پر ترجیح دیتے ہیں۔

یوسف :۔ مذاق نہیں، یہ واقعہ ہے۔ حقیقت ہے۔ صالح کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا خواہ رملہ ہو یا پرستان کی پری۔

صالح :۔ بہت بہت شکریہ اس نوازش کا۔ بس اب یہ دُعا کرو کہ خدا جمال چچا کو جلد اچھا کر دے۔ اور اگر اُن کی قسمت میں تندرستی نہ لکھی ہو تو اپنے پاس بلا لے۔ تاکہ یہ کیفیت منتظرہ تو ختم ہو کسی طرح۔

یوسف ہنسنے لگا۔

(۳۱)

بیتابی

یوسف کے رخصت ہونے کے بعد صالح سیدھا جمال کے ہاں پہنچا اگرچہ جمال کی موجودگی میں اُسے سلمیٰ سے آزادانہ ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا لیکن علالت نے یہ صورت ختم کر دی تھی۔ جمال اپنے کمرے میں رہتا تھا۔ صالح اس کی عیادت کرنے کے بعد خدیجہ کے پاس چلا جاتا تھا۔ اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر سیدھا سلمیٰ کے پاس جا کر دم لیتا تھا۔ وہ حسبِ معمول بڑے تپاک اور طبیعت سے اُس کی پذیرائی کرتی تھی۔ اور بڑی دیر تک ایسی باتیں کیا کرتی تھی، جو اُس کے دلِ مخزوں کے لیے پیامِ تسکین و تسلی ثابت ہوتی تھیں۔

آج بھی وہ سیدھا جمال کے ہاں پہنچا۔ کچھ دیر تک اس کے پاس بیٹھ کر دل جوئی اور تسلی کی باتیں کیں۔ پھر خدیجہ کے پاس آیا۔ اس کے دل پر اپنی سعادت اور محبت کا نقش بٹھا کر سلمیٰ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ باپ کی علالت کے باعث

اس وقت بہت مغموم اور رنجیدہ بیٹھی تھی۔ لیکن صالح کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئی۔ اس کی پیشوائی کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اور جب تک وہ بیٹھ نہیں گیا کھڑی رہی۔ صالح کے چہرے سے اس وقت تکدّر اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ سلمیٰ نے محسوس کر لیا۔ اور بڑے چاؤ سے پوچھا۔

کیا بات ہے آج بہت زیادہ افسردہ نظر آ رہے ہیں؟

صالح نے جواب دیا۔

کیا بتاؤں سلمیٰ دل کا کیا حال ہو رہا ہے؟

سلمیٰ:۔ آخر کوئی بات؟

صالح:۔ جمال چچا اچھے ہی نہیں ہو چکتے کسی طرح۔

سلمیٰ اگرچہ خود باپ کی بیماری سے خاصی پریشان تھی۔ لیکن اس بے ساختہ جملہ پر اُسے ہنسی آ گئی۔ اُس نے کہا۔

اچھا ہوتا کیا اپنے اختیار میں ہے؟

صالح:۔ نہ بیمار پڑنا کسی کے اختیار میں ہے، نہ اچھا ہونا مجھے تو اپنے امکان میں صرف ایک بات نظر آتی ہے اور وہی کر گزروں گا۔

سلمیٰ:۔ (گھبرا کر) کیا کر گزریں گے آپ؟

صالح:۔ خود بھی بیمار پڑ جاؤں گا۔

سلمیٰ:۔ (مسکرا کر) تو اس سے کیا ہو گا؟ کیا ابّا میاں اچھے ہو جائیں گے؟

صالح:۔ نہیں ——— لیکن میرے دل کو تسلی ہو جائے گی ——— کہ یہ اکلوتے محرومی کی مصیبت پر کسی اور کی نہیں، خود میری لائی ہے۔

سلمیٰ :۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے ۔

صالح :۔ پھر کیسی باتیں کروں ؟ میں زندگی سے عاجز آچکا ہوں ۔ ناک میں دم آگیا ہے ۔ میرا ان مجبوریوں کو سہتے سہتے ۔

سلمیٰ :۔ بجائے اس کے کہ آپ مجھے تسلی دیں ۔ اُلٹے مجھ سے تسلی کے طالب ہوتے ہیں ۔

صالح :۔ اور بھی کچھ خبر ہے ؟

سلمیٰ :۔ کوئی نئی خبر ؟

صالح :۔ ہاں ـــــ یوسف کی شادی رملہ سے طے پا گئی ۔

سلمیٰ :۔ (خوش ہوکر) سچ ؟ ـــــ کب ؟

صالح :۔ ہاں بھئی میں جھوٹ کیوں بولنے لگا ؟

سلمیٰ :۔ بڑی خوشی ہوئی ، سچ ـــــ بہت خوش ہوئی میں یہ خبر سُن کر ۔

صالح :۔ یوسف کے تو مارے خوشی کے بند قبا ٹوٹے جا رہے ہیں ۔ پاؤں مکتے کہیں ہیں پڑتا کہیں ہے ۔

سلمیٰ :۔ وہ تو ہونا ہی چاہیئے ۔ خدا دونوں کے دل کی مراد پوری کرے ۔

صالح :۔ تاریخ بھی مقرر ہوگئی ۔ !

سلمیٰ :۔ یہ اور اچھا ہوا ـــــ کون سی تاریخ طے پائی ہے ؟

صالح :۔ تین مہینے کے بعد ! ـــــ تیاری کے لیے بھی تو کچھ وقت چاہیئے ۔ عورتوں کو ۔

سلمیٰ :۔ ہاں یہ بات تو ہے ۔ لیکن یوسف کو تو بڑا صدمہ ہوگا ۔ یہ بھی مدت سُن کر ۔

صالح :- نہیں ۔ وہ بہت خوش ہے ۔ وہ کہتا ہے ۔ یہ تین مہینے پلک جھپکنے
تک گزر جائیں گے ۔ اصل مسئلہ شادی کا تھا وہ تو طے ہو گیا ۔ ا

سلمٰی :- پھر اس واقعہ سے آپ نے کیا سبق لیا ؟

صالح :- یہ کہ میں بد قسمت ہوں اور یوسف خوش قسمت ۔

سلمٰی :- یا اللہ ! یہ کیوں ؟ یہ تو بڑی عجیب بات کہہ دی آپ نے ۔ آپ
خدانخواستہ بد قسمت کیوں ہونے لگے ۔

صالح :- اُسے تین مہینے کے بعد بہر حال رملہ مل جائے گی ۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے
اور میں سلمٰی کو اس وقت تک نہیں پا سکتا ، جب تک جمال چچا نہ تندرست ہو جائیں ۔

سلمٰی :- (خفا ہو کر) واہ آپ اتنے ہراساں کیوں ہوتے ہیں ؟ خدانخواستہ ابا
جان کو کوئی خطرناک مرض نہیں ہے ۔ دس پانچ روز میں لوٹ پوٹ کے اچھے
ہو جائیں گے ـــــــ انشاء اللہ ہم لوگ یوسف اور رملہ سے پہلے ایک دوسرے
کی جان کے مالک ہو جائیں گے ۔ بجائے خوش ہونے کے آپ اُلٹے رنجیدہ
ہو رہے ہیں ۔

صالح :- جی ، بالکل اسی قسم کی باتیں یوسف بھی کر رہا تھا ۔

سلمٰی :- ہر عقل مند یہی کہے گا ۔

صالح :- یوسف نے مجھے بے وقوف اور احمق بھی کہا تھا ، وہی بات تم نے بھی
کہہ دی ـــــــ کس قدر اتفاق ہے تم دونوں کے حالات میں ـــــــ
کم از کم میری ذات کی حد تک ۔

سلمٰی :- آج تو آپ ہوا سے لڑ رہے ہیں ۔ بھلا میں آپ کو بیوقوف کہہ سکتی ہوں ۔

میرے سامنے اگر کوئی آپ کو کہے تو اُس کا مُنہ نوچ لوں۔

صالح :۔ (خوش ہوکر) تم کتنی اچھی ہو۔

سلمیٰ :۔ بہت بُری۔ بہت نالائق۔ بہت بیہودہ

صالح :۔ نہیں نہیں، یہ نہ کہو، تمھاری بُرائی میں تمھارے مُنہ سے بھی نہیں سُن سکتا

سلمیٰ :۔ بہت اچھا۔ چُپ رہتی ہوں۔ اب کچھ نہ کہوں گی۔

صالح :۔ نہیں خوب بولو، خوب کہو۔ جو تمھارا جی چاہے۔ تم نہیں جانتیں تمھاری آواز میرے لیے فردوس کا حکم رکھتی ہے۔ تمھاری باتیں سُنکر، تمھارا روپ دیکھ کر، تمھارے قریب بیٹھ کر، تمھارے نفس کی آمد و رفت محسوس کرکے میں اپنے اندر ایک عجیب قسم کی توانائی محسوس کرتا ہوں۔ تم چپ نہ ہو۔ کوئل کی طرح کوکو کر، بلبل کی طرح چہکو۔ تم اس لیے نہیں ہو کہ چپ رہو اس لیے ہو کہ تم بولو، اور لوگ سُنیں۔ سنیں اور گردن جھکا دیں۔ سلمیٰ تم اپنی قدر و قیمت سے ناواقف ہو۔ تم کیا ہو، یہ کوئی میرے دل سے پوچھے

سلمیٰ :۔ (حیران ہوکر) یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔؟

صالح :۔ کچھ نہیں!

سلمیٰ :۔ پھر ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ بارہا آپ آئے ہیں۔ اور آتے رہتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں تو آپ نے کبھی نہیں کیں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

صالح :۔ نہیں سلمیٰ ڈرو نہیں، میں پاگل نہیں ہوں۔ ہوا س باختہ اور مجنون نہیں ہوں، آج کئی دن کے بعد تمھارے درشن ہوئے۔ میں دماغی توازن کھو

بیٹھا ۔ جو باتیں صرف دل میں سوچا کرتا تھا ۔ وہ آج زبان تک آگئیں ۔
——— معاف کر دو سلمیٰ ، اب ایسی غلطی نہیں سرزد ہوگی ۔

سلمیٰ :۔ آپ کی بے کلی سے میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے ۔

صالح :۔ مجھے تم سے یہی اُمید ہے ۔

سلمیٰ :۔ آپ کو خوش دیکھ کر میں اپنا آرام بھول جاتی ہوں ۔

صالح :۔ یہی کیفیت میری ہے ۔

سلمیٰ :۔ لیکن آپ میں اور مجھ میں فرق ہے ۔ آپ مرد ہیں ۔ میں عورت ہوں ۔ آپ پر لوگوں کی تنقیدی نگاہیں نہیں پڑتیں ۔ مجھ پر پڑتی ہیں ۔ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔ میرا بگاڑا جا سکتا ہے ۔ مرد خطا کر کے بھی بچ جاتا ہے ۔ اور عورت بے خطا ہونے کے بعد بھی راندۂ درگاہ قرار دے دی جاتی ہے ۔

صالح :۔ (گھبرا کر) سلمیٰ ۔ یہ سب کچھ آگے ہوگا ۔ لیکن تم یہ باتیں کیوں کہہ رہی ہو ؟

سلمیٰ :۔ اس لیے کہ آپ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں ۔ اگر آپ کی حالت غیر ہوئی تو میں بھی اپنے تئیں نہ سنبھال سکوں گی ۔ بہت بُرا ہوگا ۔ ابّا جان کو رسوا ہونا پڑے گا ۔ امّاں کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گی ۔ سارا خاندان ذلیل ہو جائے گا ۔ اس پر انگلیاں اُٹھیں گی ۔

صالح :۔ تم ٹھیک کہتی ہو ۔ لیکن میں بھی تو مجبور ہوں ۔ لاکھ لاکھ ضبط کرتا ہوں لیکن نہیں کر پاتا ۔ جب بالکل بے بس ہو جاتا ہوں تب

سلمیٰ :۔ نہیں تب بھی ایسا نہ کیجیے ۔ کیا آپ کو مجھ پر رحم نہیں آتا ذرا ۔

اگر آپ کی یہ باتیں اماں سُن لیں یا کوئی لفظ ابا جان کے کان میں پڑ جاتا تو کیا ہوتا ——— ؟ اب تو صرف ایک شکل ہے یہ کہ جب تک آپا اچھے نہیں ہو جاتے ، شادی نہیں ہو سکتی ۔ ان حرکتوں سے اچھے ہونے کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے دُور رہنے پر مجبور رہیں گے ۔ کیوں کہ کوئی باپ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔ کہ اس کے گھر میں اس طرح کی باتیں کی جائیں

صالح :۔ (سہم کر) ہاں ٹھیک کہتی ہو ۔ میں نے اپنی غلطی محسوس کر لی ۔

سلمیٰ :۔ صرف محسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے ——— وعدہ کیجئے اب آپ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں گے ۔ بے قابو نہیں ہوں گے ۔

صالح :۔ وعدہ کرتا ہوں ، لیکن ایک وعدہ تمہیں بھی کرنا ہوگا ۔

سلمیٰ :۔ فرمایئے ۔ آپ کی ہر خواہش پوری کروں گی ۔

صالح :۔ جب تک جمال چچا اچھے نہیں ہو جاتے ، مجھے روز آنے دو ۔ یہ چند روز کا وقفہ اور زیادہ میری جان پر بنا دیتا ہے ۔ اگر ہر روز ملتا رہوں گا تو یقیناً میری یہ کیفیت نہیں ہوگی !

سلمیٰ :۔ شوق سے آیئے ——— آپ کا روز آنا خود میری بالیدگی رُوح کا سبب ہوگا ۔

اتنے میں کچھ آہٹ سی ہوئی ——— یہ خدیجہ تھی ۔ دونوں چُپ ہو گئے ۔

---

(۳۲)

انقلابی فیصلہ

ایک روز صالح کے پاس جمال کا ایک فرستادہ پہنچا۔

"جلدی چلئے، آپ کو بلایا ہے"

صالح گھبرا گیا۔ اُس نے کہا۔

چلتا ہوں، لیکن خیریت تو ہے ——— ؟ طبیعت کیسی ہے ؟

وہ بولا۔

طبیعت ویسی ہی ہے جیسی تھی۔ بلکہ رات کو تو بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس وقت ذرا سنبھلی ہے۔ مجھے حکم دیا کہ آپ کو بُلا لاؤں"

صالح نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور اُفتاں و خیزاں جمال کے ہاں پہنچا راستے بھر اس کا دل دھڑکتا رہا۔ بار بار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کیوں بُلایا ہے ؟ وہ

کون سی خاص بات ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے آدمی بھیج کر طلب کیا۔ کہیں کسی دشمن نے تو کچھ دراندازی نہیں کی؟

یہ سوچتے ہی وہ اور زیادہ حواس باختہ ہو گیا۔

کیا ایسا ہو گا کہ سلمیٰ مجھ سے چھین لی جائے گی۔

نہیں۔ سلمیٰ میری ہو چکی ہے۔

اُسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اپنی اور اس کی جان ایک کر دوں گا۔

وہ جمال کے روبرو پہنچ کر خاموش بیٹھ گیا۔

واقعی جمال کی حالت پہلے کی بہ نسبت اور زیادہ ابتر ہو چکی تھی۔ بخار کسی طرح اترنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ وہ نحیف و نزار اور توانا جسم اب ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

صالح نے کہا

"آپ نے یاد فرمایا تھا، میں حاضر ہو گیا"۔

وہ بولا۔

ہاں بیٹے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے"۔

صالح :۔ تکلیف کاہے کی۔ آپ کا معمولی سا ارشاد بھی میرے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمال :۔ یہ تمہاری سعادت و شرافت ہے ـــــ مجھے آج تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

صالح :۔ ارشاد ـــــ میں گوش ہوش سے سُن رہا ہوں۔

جمال :۔ خدیجہ کا انتظار ہے۔ جو کچھ کہنا ہے اس کے سامنے کہوں گا کیونکہ اس بات سے اس کا بھی تعلق ہے۔

صالح :۔ میں جاتا ہوں۔ اُنھیں بلائے لاتا ہوں۔

جمال :۔ نہیں، وہ آ ہی رہی ہوگی۔ شاید تمھارے ناشتہ کی فکر کرنے لگی۔"

اتنے میں خدیجہ آئی۔ جمال نے کمزور آواز میں کہا۔

کہاں رہ گئی تھیں؟ بڑی دیر لگادی۔"

خدیجہ :۔ کہیں نہیں، ابھی اطلاع ملی تھی۔ صالح آگیا ہے۔ فوراً چلی آئی۔

جمال :۔ سلمیٰ کیا کر رہی ہے؟

خدیجہ :۔ ناشتہ تیار کر رہی ہے۔

جمال :۔ اچھا ——— لیکن اُسے منع کر دو کہ ادھر نہ آئے۔

خدیجہ :۔ منع کر دیا ہے ——— میں کوئی بچہ نہیں۔

یہ الفاظ سُن کر صالح کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

سلمیٰ کے یہاں آنے کی ممانعت کیوں کی گئی ہے۔

کوئی آج پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں؟ ——— اکثر آتا رہتا ہوں ——— پھر آج یہ نئی بات کیوں؟

اور ہاں یہ خدیجہ چچی کو کیا ہو گیا۔ کیا وہ بھی یہ نہیں چاہتیں۔ کہ میں سلمیٰ کا دیدار کر لوں؟ اس سے باتیں کر لوں؟ اب یہ عجیب قسم کی اور سراسر ظالمانہ وسفاکانہ پابندی مجھ پر کیوں عائد کی جا رہی ہے؟

نہیں، میں ان پابندیوں کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میں سلمیٰ سے ملوں گا

کوئی۔ مجھے اس سے ملنے سے روک نہیں سکتا۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ جمال کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے تمھیں کیوں تکلیف دی ہے؟ جانتے ہو؟

صالح :۔ بالکل نہیں چچا جان!

جمال :۔ دیکھ رہے ہو میری حالت کیا ہے؟

صالح :۔ آپ بیمار ہیں، بہت کمزور ہو گئے ہیں

جمال :۔ پہلے یہ خیال تھا۔ کہ تندرست ہو لوں تو اپنے حوصلوں اور امنگوں کے مطابق سلمیٰ کا تم سے بیاہ کر دوں۔

خدیجہ :۔ خدا چاہے گا۔ تندرست ہو جاؤ گے۔ کون سی بوڑھی ہوئی جا رہی ہے سلمیٰ ——

جمال :۔ نہیں تم نہیں جانتیں —— میں اب اچھا نہیں ہو سکتا۔

صالح :۔ چچا جان یہ نہ کہیے۔ خدا آپ کو ضرور تندرستی عطا فرمائے گا۔ بخار کوئی ایسا مہلک مرض نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی دیر میں ٹوٹتا ہے۔

خدیجہ :۔ ہاں اور کیا —— بھلا مایوسی کی کوئی بات بھی ہے —— بچے کیوں بن گئے ہو۔

جمال :۔ (زیر لب تبسم کے ساتھ) نہیں خدیجہ تم نہیں جانتیں۔ مجھ سے بہتر میرا حال کوئی نہیں جانتا۔ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔ —— کسی طرح نہیں

خدیجہ :۔ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ سلمیٰ سُن پائے گی تو روتے روتے اپنا حال خراب کر لے گی۔

جمال :۔ ہاں۔ تسلی تک یہ باتیں نہ پہنچیں۔

خدیجہ :۔ لیکن باتوں کا آخر تک کیا ہے؟ ——— کیا اسی لیے مجھے اور صالح کو بلایا تھا؟

جمال :۔ ہاں اسی لیے ——— بات یہ ہے کہ میری زندگی کا اب کوئی اعتبار نہیں۔

صالح :۔ چچا جان اس طرح کی دل خراش باتیں نہ کیجئے۔

جمال :۔ اچھا، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مانے لیتا ہوں کہ اچھا ہو جاؤں گا۔

خدیجہ :۔ ہاں ضرور ——— انشاء اللہ۔

صالح :۔ بے شک ——— آپ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے۔

جمال :۔ اچھا بیٹے اچھا ——— خدا کرے تیرے دل کا کہنا سچ ثابت ہو۔

خدیجہ :۔ بس تو اب میں جاتی ہوں، کہہ چکے جو کچھ کہنا تھا۔

جمال :۔ نہیں ابھی نہیں۔

خدیجہ :۔ تو کہہ چکو جلدی سے۔

جمال :۔ میری حالت دیکھ کر کم از کم یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں میرے صحت مند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

خدیجہ :۔ ہاں انشاء اللہ دو تین ہفتے میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔

صالح :۔ زیادہ سے زیادہ مہینہ بھر سہی۔

جمال :۔ لیکن اب میں انتظار نہیں کر سکتا ۔ میں چاہتا ہوں کہ سلمیٰ اور صالح کی شادی جلد از جلد ہو جائے ۔

صالح خاموش ہو رہا ۔ بلکہ دل میں رضامند بھی ہو گیا اس تجویز سے ۔

خدیجہ :۔ آخر اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟

جمال :۔ میری مرضی ۔

خدیجہ :۔ واہ اچھی تمہاری مرضی ہے ۔ خدا تمہیں اچھا کر دے ، تب ہی یہ باتیں اچھی لگیں گی ۔

صالح :۔ ہاں چچا جان خدا آپ کو تندرست کر دے ۔ پھر یہ رسم بھی انجام پا جائے گی ۔

جمال :۔ میں کہتا ہوں ، آخر تم لوگوں کو تعجیل کیوں ہے؟ ——— صالح کیا تم نہیں چاہتے کہ سلمیٰ سے تمہاری شادی ہو؟

صالح :۔ میری تمنا اور خواہش کا آپ کو علم ہے ۔

جمال :۔ تم بتاؤ خدیجہ ——— کیا تمہاری یہ مرضی نہیں ۔

خدیجہ :۔ یہ تو میری مرضی نہیں تو کس کی ہے؟ ——— میں نے ہی تو تمہیں راضی کیا تھا ۔

جمال :۔ کیا ہم نے ابراہیم اور سکینہ بہن اور اُم کلثوم سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جلد از جلد یہ رسم انجام پا جائے گی ۔

خدیجہ :۔ ہاں کہا تھا ۔

جمال :۔ مگر میری بیماری کی وجہ سے دیر ہوتی گئی ۔ یہاں تک کہ کئی مہینے گذر گئے

خدیجہ :۔ ہاں یہ تو ہے ۔

جمال :۔ میں نے سنا ہے یوسف کی اگلے جمعہ کو شادی ہو رہی ہے رملہ کے ساتھ
—— کیوں صالح ؟

صالح :۔ جی آپ نے صحیح سنا ہے ۔

خدیجہ :۔ رملہ —— رملہ کیون ؟

صالح :۔ وہ جو سکینہ چچی کی بڑی گہری دوست ہیں ۔

خدیجہ :۔ وہی ، جو ابھی حال میں آئی ہیں ، ان کی لڑکی —— ؟

صالح :۔ جی وہی ۔

خدیجہ :۔ ہاں میں نے اسے دیکھا ہے ۔ بڑی پیاری لڑکی ہے ۔

صالح :۔ جی وہی ، وہی

خدیجہ :۔ تو اتنی جلدی شادی طے ہو گئی —— ؟ اس کی یوسف کی تو
شاید کسی اور جگہ نسبت تھی ۔

صالح :۔ جی تھی تو —— لیکن سکینہ چچی اور یوسف نے رملہ
ہی کو پسند کیا ۔

خدیجہ :۔ میں سمجھی یہ کہ یوسف کی شرارت ہے ۔

صالح :۔ (مسکرا کر) یہی سمجھ لو ۔

جمال :۔ خیر ۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یوسف کی شادی ہو رہی ہے ۔ اور جب صالح
اور سلمیٰ کے عقد کا مسئلہ طے ہوا تھا ، اُس وقت تک یوسف کے عقد کا
اس قدر جلد وہم و گمان بھی نہیں تھا ۔

خدیجہ:۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔

جمال:۔ پھر میں اپنے بچے صالح پر ظلم نہیں کر سکتا۔

خدیجہ:۔ تمہاری مرضی ہے کہ ان دونوں کی بھی یوسف اور رملہ کے ساتھ ساتھ شادی ہو جائے۔

جمال:۔ ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔

خدیجہ:۔ خیر۔ اگر یہ بات ہے تو میں کچھ اعتراض نہیں کرتی۔

جمال:۔ یہی تو کہہ رہا ہوں۔ میری ناشدنی علالت کی سزا یہ دونوں معصوم کیوں بھگتیں آخر؟

صالح:۔ (بن کر۔ لیکن دل میں خوش ہو کر) چچا جان جی تو یہی چاہتا تھا کہ آپ کے غسل صحت کے بعد یہ رسم انجام پاتی۔

جمال:۔ نہیں، یہ میری رائے نہیں فیصلہ ہے۔ اور اپنا فیصلہ بالعموم میں نہیں بدلا کرتا۔

خدیجہ:۔ (مسکرا کر) ہمیں تمہارا فیصلہ منظور ہے۔

جمال:۔ بس تو پھر انتظامات شروع کر دو ——— اب جمعہ میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔

خدیجہ:۔ کیا اسی جمعہ کو؟

صالح:۔ (جلدی سے) جی ہاں۔ یوسف اور رملہ کی شادی اسی جمعہ کی طے پائی ہے۔

خدیجہ:۔ (مسکرا کر) تجھ سے کس نے پوچھا تھا؟

صالح نے مسکرا کر گردن جھکا لی۔

جمال:۔ ہاں بھئی۔ اسی جمعہ کو ہے۔ اور انشاء اللہ اسی مبارک دن میرے ان دونوں بچوں کی رسم نکاح بھی انجام پا جائے گی۔ آج ہی ابراہیم اور اُم کلثوم کو اس فیصلہ کی اطلاع دے دو۔

خدیجہ:۔ دے دوں گی ——— بلکہ یہ صالح بیٹھا ہے۔ کہدے گا جا کر اپنے ماں باپ سے۔

صالح:۔ جی ہاں۔ میں انھیں آپ کے فیصلہ سے مطلع کر دوں گا۔

خدیجہ:۔ لیکن آج ہی ورنہ وقت کی تنگی کی اُم کلثوم بہن بھی شکایت کریں گی۔

صالح:۔ مطمئن رہیئے میں یہاں سے سیدھا گھر جا رہا ہوں۔ اور ابھی جا کر والدہ کو اطلاع دے دوں گا۔

جمال:۔ بس تو بیٹا اب جاؤ۔

صالح اسلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اور کوئی وقت ہوتا تو صالح سلمیٰ سے ملے بغیر یا تاک جھانک کئے بغیر واپس آجانا۔ یہ ناممکن تھا۔ لیکن اس وقت اس نے پرواہ بھی نہیں کی۔ سلمیٰ کہاں بیٹھی ہے، تیزی سے جمال کے کمرے سے باہر نکلا۔

ڈیوڑھی کے قریب پہنچا تھا۔ کہ سلمیٰ اسے آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہی دل فریب تبسم، وہی جان لیوا ادائیں، وہی ناز وہی انداز۔ اس نے صالح کے پاؤں پکڑ لیے نہ آگے بڑھا سکتا تھا۔ نہ پیچھے ہٹا سکتا تھا۔ جہاں تھا۔ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سلمیٰ قریب آگئی، اُس نے کہا۔

"یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ ـــــ کہاں آئے، کہاں چلے؟"
اب صالح کے ذرا ہوش و حواش درست ہوئے۔ اُس نے ایک عجیب والہانہ انداز میں کہا۔

سلمیٰ ـــــ تم نے بھی کچھ سُنا؟

وہ بولی۔

نہیں، کیا کوئی نئی بات رُونما ہوئی؟

صالح:۔ عجیب خبر ہے۔

سلمیٰ:۔ تو بتاتے کیوں نہیں؟ ـــــ بتایئے ورنہ میں جاتی ہوں۔

اتنے میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ شاید خدیجہ اپنے شوہر کے پاس سے واپس آرہی تھی۔ سلمیٰ اس چاپ سے سنبھل گئی۔ اور صالح صاحب نے فرار ہونے کے لئے قدم اٹھایا۔ جاتے جاتے صرف اتنا کہا۔

"جمعہ ـــــ شادی"

صالح چلا گیا۔

اور سلمیٰ سوچنے لگی، یہ شخص کیا کہہ گیا ـــــ شنبہ ـــــ یا جمعہ ـــــ شادی ـــــ عجیب معمّہ ہے۔ کس کی شادی ہے؟ ـــــ کیا ہماری؟ ـــــ نہیں جب تک ابا جان علیل ہیں، ہماری شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

پھر کس کی شادی ہے؟

کیا یوسف کی؟

نہیں۔ یوسف کی بھی اتنی جلدی کیسے ہو جائے گی؟

دفعتاً سلمیٰ کے ذہن میں یہ خیال آیا۔

کہیں صالح کا دماغی توازن تو نہیں خراب ہو گیا ہے؟

اس سوال کو ابھی وہ دل ہی دل میں دُہرا رہی تھی اور دل نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا، کہ خدیجہ سامنے سے آگئی۔ اُس نے پوچھا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہے لڑکی؟"

وہ بولی۔

"ابّا جان کے پاس جا رہی تھی۔"

خدیجہ:۔ اور میں نے منع جو کیا تھا وہاں جانے کو۔

سلمیٰ:۔ تو کیا وہ وہاں اب تک بیٹھا ہوا ہے؟

خدیجہ:۔ نہیں، گیا۔

سلمیٰ:۔ اماں وہ کون تھا؟

خدیجہ:۔ (مسکرا کر) تجھے کیا؟ ہو گا کوئی ——!

سلمیٰ:۔ نہ بتایئے۔

خدیجہ:۔ بتا دوں؟ —— وہ مہمان تھا صالح —— کیا تو نے ابھی صالح کو یہاں سے جاتے نہیں دیکھا؟

سلمیٰ: ہاں دیکھا تھا۔ ابھی تو گئے ہیں ادھر سے۔

خدیجہ:۔ بس وہی۔

سلمیٰ:۔ تو آپ نے مجھے اُس طرف گزرنے سے کیوں منع کیا تھا؟

خدیجہ:۔ خدیجہ معلوم ہو جائے گا بہت جلد۔

سلمیٰ :۔ کیا میں اُن سے نہ ملا کروں ؟

خدیجہ :۔ ارے یہ خیال تیرے دل میں کیسے آیا ؟

سلمیٰ :۔ آپ نے ادھر آنے سے منع کیا۔ اُن کا نام بتانے کی بجائے صرف یہ کہا کہ ایک مہمان آ رہا ہے ۔ ان باتوں سے میں اندازہ کر رہی ہوں۔ آپ یا اباجان ان سے خفا ہیں ۔

خدیجہ :۔ نہیں بیٹی ہم بالکل خفا نہیں ہیں ۔

سلمیٰ :۔ پھر کیا راز تھا ؟

خدیجہ :۔ ابھی بتا دوں ؟ ——— اچھا سُن۔ تیرا اور اُس کی شادی طے ہو گئی انشاءاللہ جمعہ کے دن تو دولہن بنے گی ۔ اور صالح اس گھر میں دُولہا بن کر آئے گا ۔

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے

کتنی حسرت تھی مجھے اس پیارے دن کی ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری مراد پوری کی ۔

یہ کہتے کہتے وفورِ محبّت سے خدیجہ نے سلمیٰ کی پیشانی چوم لی —

سلمیٰ نے پوچھا ۔

"لیکن امّاں، ابھی اتنی جلدی کیسے ؟

خدیجہ :۔ کیوں کیا ہوا ؟

سلمیٰ :۔ ابھی تو نصیب دشمناں اباجان بیمار ہیں

خدیجہ :۔ خدا اچھا کر دے گا انھیں ———

سلمیٰ :— لیکن ابھی تو بیمار ہیں۔ (بچوں کی طرح ضد کرکے) نہیں۔ پہلے انھیں اچھا ہو لینے دیجئے۔ وہ جب تک بیمار ہیں مجھے کوئی بات بھی اچھی نہیں لگے گی۔

خدیجہ نے کہا۔

بات یہ ہے بیٹی کہ خود میری بھی یہی رائے تھی۔ کہ وہ تندرست ہو جائیں تب یہ رسم انجام پائے۔ اسی لیے کہ یوسف اور رملہ کی شادی ہو رہی ہے ہم نے کہا۔ پھر ہم صانع اور سلمیٰ کو بھی کیوں نہ بیاہ دیں —— ؟

سلمیٰ شرما گئی۔

---

(۳۳)

مرو کا نیا حاکم

ادھر کچھ دنوں سے مرو کے داخلی امن و امان میں کچھ فرق سا آگیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا شہر تھا۔ تجارت اور کاروبار کے فروغ نے یہاں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کو لا بسایا تھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے۔ یہودی بھی، عیسائی بھی اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی۔ یہ سب امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سب میں وہی باہمی تعلقات تھے۔ جو ایک مہذب شہر کے مہذب باشندوں میں ہونے چاہئیں۔ لیکن مرو پر کچھ دنوں سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات تلخ ہو رہے تھے، اور یہ تلخی روز بروز نازک صورت اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔

واقعہ یہ ہوا کہ مرو میں ایک دریدہ دہن اور بدزبان عیسائی مبلغ آیا۔ جسے

لوگ پادری یوحنا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جہاں کے عیسائیوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں تک تو قابلِ اعتراض بات نہیں تھی کہ ایک عیسائی پادری آیا۔ اور عیسائیوں نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بات یہاں سے بڑی کہ اس نے مناظرانہ تقریریں جلسۂ عام میں شروع کر دیں۔ ان تقریروں میں وہ اسلام کے خلاف ایسی زہر چکانیاں کرتا، داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے خلاف ایسی دریدہ دہنی کی باتیں کرتا۔ اور اسلام کے روشن کارناموں کو کچھ ایسے بُرے انداز میں پیش کرتا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو غصّہ آتا اور دوسری طرف عیسائیوں کی ہمّت اور بڑھ جاتی۔

یہ سیلاب کب تک رُکا رہتا؟ مسلمان اگرچہ بڑی رواداری سے کام لے رہے تھے۔ اور مسلم حکومت پوری وسعتِ قلب کے ساتھ عیسائیوں کو آزادیٔ تقریر و آزادیٔ اجتماع دے رہی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس چیز کو مسلمانوں کی مداہنت اور مسلم حکومت کی کمزوری پر محمول کیا گیا۔ عیسائی اور زیادہ کھل کھیلے۔ انھوں نے علانیہ دل آزار اور تکلیف دہ حرکتیں شروع کر دیں۔ آخر مرو کا امن و امان درہم برہم ہو گیا، اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں فتنہ فساد اور کشت و خون تک نوبت پہنچ گئی۔ رفتہ رفتہ ان فسادات نے روزمرہ کے واقعات کی صورت اختیار کر لی۔ جس سے ایک طرف عام کاروبار پر بُرا اثر پڑا، دوسری طرف ایک شہر میں رہنے والے دو فرقوں کے درمیان نفرت اور عداوت کی ایک خلیج پیدا ہو گئی۔

جب مرو کے حالات اعتدال پر نہ آئے تو مرکزِ خلافت نے ایک نیا حاکم شہر بھیجا۔ اور سابق حاکم شہر کو واپس بُلا لیا۔

اس نئے حاکم نے آتے ہی تشدّد اور سختی کا مقابلہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں پر
یادہ اور عیسائیوں پر کم۔ کچھ تو حد سے بڑھے ہوئے رواداری کے جوش میں اور کچھ
س لیے کہ اس حاکم کی والدہ ایک عیسائی عورت تھی۔ یوں تو عیسائی عورتوں اور
سلمان مردوں میں شادی عام طور پر ہوتی رہتی۔ اس لیے کہ اسلام نے اسے جائز
کیا تھا۔ لیکن مسلمان حاکم شہر کی عیسائی ماں مذہبی اعتبار سے بہت متعصب تھی۔ اور
چونکہ یہ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس لیے ماں کے رنگ سے زیادہ متاثر ہوا باپ
ندہ ہوتا تو وہ راہ پر لے آتا۔ لیکن وہ وفات پا چکا تھا۔ اور یہ عیسائی عورت
نے گھر میں اس کی تربیت کرتی رہی۔

حاکم شہر نے مرو آنے کے بعد شہر کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے سربرآوردہ
صحاب کو دارالامارۃ میں بلایا۔ اور ان سب کے سامنے اس نے نہایت برہمی کے
الم میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ حضرات کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ اب اگر کسی کی طرف سے ذرا بھی
شورش کا مظاہرہ ہوا، تو میں پوری شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ ان لوگوں کی
گردن اُترو ا دوں گا۔ جو کسی جُرم کے مرتکب پائے جائیں گے۔ اس معاملہ میں کسی
کے ساتھ میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ خواہ وہ میرا عزیز قریب ہی کیوں نہ ہو۔"

حاکم شہر نے یہ تقریر اتنے درشت لہجہ میں کی کہ حاضرین پر سناٹا سا چھا گیا۔
سب خاموش تھے۔ اور سہمے ہوئے تھے۔

حاکم شہر نے کہا۔ سن لیا آپ حضرات نے؟
ایک مسلمان اُٹھا اور اُس نے کہا۔

"ہاں سُن لیا۔ لیکن ـــــ!"

حاکم شہر :ـ لیکن ویکن کچھ نہیں ـــــ اگر سُن لیا تو گرہ میں بات باندھ لو۔ نہ سُنا ہو تو پھر میں دوسری طرح سے سُنا دوں ۔

وہ بولا ۔

آپ حاکم شہر ہیں۔ جو آپ چاہیں اپنی بات سُنا سکتے ہیں۔ لیکن میں بھی ایک شہری ہوں ۔ اور میری بات بھی آپ کو سُننی ہو گی ۔ !"

حاکم شہر :ـ کہو ، میں سُن رہا ہوں۔

مسلمان :ـ تقریر کرنے سے پہلے آپ کو یہ تحقیق کرنی چاہیے تھی کہ اب تک کون زیادتی کرتا رہا ہے ۔

حاکم شہر :ـ یہ تحقیق کر چکا ہوں ۔

مسلمان :ـ پھر آپ نے کیا پایا ۔

حاکم شہر :ـ میری اطلاعات یہ ہیں کہ زیادتی دونوں طرف ہوئی ۔

مسلمان :ـ تو پھر آپ کی اطلاعات ناقص ہیں۔ غلط ہیں ، اصلاح طلب ہیں ،

حاکم شہر :ـ تمہارا نام ؟

مسلمان :ـ میرا نام یوسف ہے ۔

حاکم شہر :ـ تم زبیدتا جر کے بیٹے ہو ؟

یوسف :ـ جی جناب میں اُنہی کا بیٹا ہوں ۔

حاکم شہر :ـ تمہیں کاروبار کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہیے ، نہ کہ فتنہ فساد کی طرف

یوسف :ـ کاروبار کی ترقی امن وامان پہ منحصر ہے ۔ اور امن وامان کا انحصار اس

پہ ہے کہ حاکم شہر بغیر کسی جانبداری کے مجرمین کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔

حاکم شہر:۔ تم مجرمین کو جانتے ہو ــــ نشان دہی کر سکتے ہو؟

یوسف:۔ میں صرف ایک مجرم کو جانتا ہوں ــــ اور وہی سب سے بڑا مجرم ہے۔

حاکم شہر:۔ کون ہے وہ؟

یوسف:۔ پادری یوحنّا

حاکم شہر:۔ میں پادری یوحنا سے مل چکا ہوں۔ مجھے تو وہ بہت معقول آدمی نظر آتا ہے

یوسف:۔ کاش آپ نے اس کی زہر آلود، اشتعال انگیز اور شعلہ بار تقریریں بھی سُنی ہوتیں

حاکم شہر:۔ ہاں، میں ان کا تذکرہ سُن چکا ہوں۔

یوسف:۔ تو اب تک آپ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟

فتنہ کا سر کچل دیجیے۔ فتنہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

حاکم شہر:۔ یہ میرا کام ہے، تمھارا نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے، میں جانتا ہوں۔

یوسف:۔ کاش آپ جانتے ہوتے!

حاکم شہر:۔ شاید تم یہاں سے اپنے گھر واپس جانا نہیں چاہتے؟

یوسف:۔ شاید آپ کی دھمکیاں حقائق کو نہیں بدل سکتیں ــــــــ

آپ کو نہیں علم، پادری یوحنا کی تقریروں نے مسلمانوں کے قلوب میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ وہ قرآن کی توہین کرتا ہے۔ اسلام کو گالیاں دیتا ہے۔ رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے رسم و رواج کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہی بنیاد ہے اس ساری ہنگامہ آرائی کی۔

حاکم شہر:۔ آخر تمھارا مقصد کیا ہے؟

یوسف :۔ صرف ایک!

حاکم شہر :۔ میں سن رہا ہوں، کہو ——

یوسف :۔ پادری یوحنا کو جیل بھیج دیجئے۔

حاکم شہر :۔ نہیں —— آج کی تنبیہ سے پہلے کی غلطیوں پر میں کوئی سزا دینا نہیں چاہتا۔

یوسف :۔ تو وہ جہاں سے آیا ہے وہاں اُسے واپس بھیج دیجئے۔

حاکم شہر :۔ نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔

یوسف :۔ تو یوحنا کی زبان بند کر دیجئے —— حکم دے دیجئے کہ وہ تقریریں کرنا چھوڑ دے۔ کم از کم مخلوط جلسوں میں دل آزار تقریروں کا سلسلہ بند کر دے۔

حاکم شہر :۔ اور اگر میں یہ بھی نہ کروں؟

یوسف :۔ تو پھر امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

حاکم شہر :۔ وہ میری تلوار کرے گی۔

یوسف :۔ لیکن اگر بغیر تلوار کے کام چل سکتا ہو تو تلوار کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟

حاکم شہر تم ابھی تو عمر ہو، لیکن بڑھ بڑھ کے باتیں کر رہے ہو۔ یہی باتیں اگر کسی سن رسیدہ آدمی نے کی ہوتیں تو اُس کی گردن سر سے محروم ہو چکی ہوتی۔

یوسف :۔ آپ کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن حاکم عادل کی خصوصیت یہ

ہوتی ہے کہ معقول باتیں سنے ۔ اُن پر غور کرے ۔ اور اگر وہ مناسب ہوں تو اُن پر عمل کرے ۔

حاکم :۔ ہاں ۔ میرا اصول بھی یہی ہے ۔

یوسف :۔ لیکن آپ نے میری بات کے سُننے سے انکار کیا، پھر سُننے پر آمادہ ہوئے تو ماننے سے انکار کر دیا ۔ پھر آپ سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے ۔ کہ آپ عدل و انصاف سے کام لیں گے ۔

حاکم شہر :۔ اس کا جواب مستقبل دے گا ۔

یوسف :۔ خدا کرے وہ جواب توقعات کے خلاف ہو ۔

حاکم شہر :۔ یعنی تمھیں توقع ہے کہ ہم انصاف نہیں کریں گے ؟

یوسف :۔ آپ کا طرزِ عمل یہی کہہ رہا ہے ——— میں پھر نہایت خلوص سے آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ اگر امن و امان قائم کرنا ہے، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلح و سلام کی فضا پیدا کرنا ہے ۔ فتنہ و فساد اور کُشت و خون کا استیصال کرنا ہے ، تو آپ کو میری بتائی ہوئی تجویزوں میں سے کسی ایک پر ضرور عمل کرنا پڑے گا ۔

حاکم شہر :۔ تمھارے خیال میں امن و امان کس طرح قائم ہو سکتا ہے ۔

عیسائی :۔ اس طرح کہ دل آزار تقریروں کی ممانعت کر دی جائے ۔

حاکم شہر :۔ کیسے ممانعت کر دی جائے ۔

عیسائی :۔ ہر مقرر کو ——— خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی ، یا کسی بھی مذہب کا پیرو ۔

حاکم شہر :۔ تمہاری رائے معقول ہے ——— کیا تم کسی ایسے مقرر کا نام لے سکتے ہو جو تمہارے خیال میں دل آزار تقریریں کرتا ہو؟

عیسائی :۔ نہیں ——— میں نے اصولی بات کہی ہے۔

حاکم شہر :۔ تمہارے کانوں تک کسی مسلمان واعظ کی کسی ایسی تقریر کا ذکر پہنچا ہو جس نے عیسائیوں کی دل آزاری کی ہو۔

عیسائی :۔ قطعاً نہیں۔

حاکم شہر :۔ اگر ہم نے پادری یوحنا کی زبان بندی کر دی تو تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

عیسائی :۔ اگر وہ دل آزار تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ تو ضرور یہ پابندی عائد ہونی چاہیے۔

حاکم شہر :۔ کیا تم نے پادری یوحنا کی کوئی تقریر نہیں سُنی

عیسائی :۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔

حاکم شہر :۔ تعجب ہے ——— کیا تم اس شہر میں وارد ہو ——— ؟

عیسائی :۔ جی ہاں ——— میں کل ہی آیا ہوں۔ اور اپنے معزز میزبان کے ساتھ یہاں تک آگیا۔

حاکم شہر نے مجلس برخاست کر دی۔ اور حرم میں چلا گیا۔

اس کے جانے بعد لوگ بھی باہر نکلے۔ دروازے پر یوسف کی ایک عیسائی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اُس نے کہا۔

میں تمہیں بہت نیک اور غیر متعصب سمجھتا تھا۔ آج معلوم ہوا تم کتنے بڑے

مفسد ہو ——— یاد رکھو اس شہر میں کسی مفسد کو امان نہیں ملے گی "
یوسف حیرت سے اُس کی صورت دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا۔
میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔
وہ عیسائی بولا۔
ہاں تم مجھے نہیں جانتے۔ لیکن میں تمھیں جانتا ہوں ——— اور آج تو بہت اچھی طرح جان گیا ——— کیا تم نے حاکم مرو کے کاتب (سیکرٹری) بختیشوع کا نام نہیں سُنا؟
یوسف :۔ خوب سُنا ہے ——— یوحنا کا سب سے بڑا سرپرست اور مربی وہی ہے!
بختیشوع :۔ تو کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو؟
یوسف :۔ اچھا وہ بزرگ آپ ہیں! بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ نئے حاکم نے آپ کی فتنہ انگیزیوں اور تفرقہ پردازیوں کا یہ انعام دیا ہے آپ کو ——— مبارک!
بختیشوع :۔ تمھیں یاد رکھنا چاہیے۔ تمھارا ایک ایک لفظ جو تم استعمال کر رہے ہو، کچھ معنی رکھتا ہے۔ اور ہر معنی، اپنا کوئی نہ کوئی اثر بھی رکھتا ہے۔ اپنے الفاظ کے اثرات سے تم بچ نہیں سکو گے!
یوسف :۔ شکریہ اس نوازش کا۔
بختیشوع نے اُسے برہم نظروں سے دیکھا اور چلا گیا۔

(۳۴)

مسجد کی طرف

دونوں گھروں میں بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ سکینہ، اُم کلثوم، خدیجہ، فاطمہ اور حلیمہ کی مصروفیتیں قابل دید تھیں۔ جمال اور ابراہیم بھی پھولے نہ سماتے تھے۔ صالح اور یوسف کی مسرت کا اندازہ اگر کوئی کر سکتا تھا۔ تو صرف سلمیٰ اور رملہ ——— جمعہ میں اب مدّت ہی کتنی باقی رہ گئی تھی ——— صرف ایک دن کی۔

صالح زنان خانے سے باہر نکلا تو یوسف سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر صالح نے پوچھا۔

"کہاں چلے اے جانِ قیس ——— تیرا ارادہ کدھر ہے آج" ؟

یوسف مسکرایا۔

"کہیں نہیں ——— ذرا یونہی سیر سپاٹے کو ——— آؤ تم بھی چلو۔"

صالح :— مجھے ساتھ چلنے میں عذر نہیں۔ لیکن کہاں؟

یوسف :— یہیں شہر تک چلتے ہیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کریں آجائیں گے تھوڑی دیر میں آؤ!

صالح ساتھ ہو لیا۔ راستے میں دونوں کے درمیان باتیں شروع ہو گئیں۔

یوسف :— کل جانتے ہو کون سا دن ہے؟

صالح :— ہاں — وہ دن — دن گنے جاتے ہیں جس دن کے لیے کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟

یوسف :— ہاں بھئی، بالکل سچ ——— واقعی کل وہ دن ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔

صالح :— رملہ کا کیا حال ہے ———؟ وہ بھی خوش ہے؟

یوسف :— بہت زیادہ ——— پھولی نہیں سماتی۔

صالح :— کچھ بات چیت بھی ہوئی، تم میں اور اُس میں؟

یوسف :— (آہ سرد کے ساتھ) نہیں ——— میں تمھاری طرح خوش قسمت کہاں ہوں۔ تم جب چاہو سلمیٰ سے مل سکتے ہو۔

صالح :— الحمد اللہ

یوسف :— لیکن میں نہیں مل سکتا ——— اماں منع کرتی ہیں۔ اور خود رملہ بھی چھپتی ہے

صالح :— وہ تو خیر ہونا ہی چاہیے۔ محبّت کی بات دوسری ہے۔ ورنہ تم میں اور رملہ میں وہ بے تکلفی تو نہیں ہو سکتی جو مجھ میں اور سلمیٰ میں ہے ——— ہم دونوں محبّت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں ——— اور تم ابھی طفلِ دبستاں ہو۔

—— کے آدمی کے پیر شدی

یوسف :— (ہنس کر) پھر وہی بدمعاشی —— ؟ آ گئے اپنی اوقات پر —— !

صالح :— کیوں غلط کہا کچھ میں نے ؟

یوسف :— اصل چیز محبت ہے —— وہ تو مجھے حاصل ہے۔ رہی بے تکلفی وہ بھی دور ہو جائے گی، چند روز میں ۔

صالح :— ہاں اور کیا ۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

یوسف :— یہی سمجھ لو —— لیکن یہ تو بتاؤ صالح کل کب آئے گا ؟

صالح :— یہی تو میں خود تم سے پوچھنے والا تھا —— واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک دن کاٹے نہیں کٹتا ۔

یوسف :— ہاں —— یہ معلوم ہوتا ہے فراق کا سارا زمانہ ایک طرف اور یکم بخت ایک دن ایک طرف ۔

صالح :— لیکن انشاء اللہ یہ بھی کٹ جائے گا ۔ پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے ۔ وصل اور کامرانی و شادمانی کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہوگا ۔ ہم ہوں گے اور ہماری سلمیٰ —— تم ہو گے اور تمہاری رملہ —— !

یوسف :— انشاء اللہ —— لیکن نہ جانے کیا بات ہے ؟

صالح :— دل دھڑکتا ہے ۔

یوسف :— ہاں —— میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا —— !

صالح :۔ تمھاری بات میں نے پوری کردی ـــــ لیکن میری بھی یہی کیفیت ہے

یوسف :۔ لیکن کیوں آخر ؟

صالح :۔ ممکن ہے رملہ کی بھی یہی کیفیت ہو ـــــ پوچھ دیکھو ـــــ !

یوسف :۔ تم نے سلمیٰ سے پوچھا تھا ؟

صالح :۔ ہاں پوچھا ـــــ بلکہ بغیر پوچھے وہ کہہ رہی تھی ـــــ خوشی سے دل دیوانہ ہوا جارہا ہے ۔ لیکن ایک اَن جانی سی چبھن بھی محسوس ہورہی ہے

یوسف :۔ پھر تم نے کیا کہا ؟

صالح :۔ میں نے کہا ، مسرت جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو یہی عالم ہوتا ہے

یوسف :۔ پھر وہ مطمئن ہوگئی ـــــ ؟

صالح :۔ کچھ پاگل ہوئے ہو ـــــ ! مطمئن نہ ہوتی تو کیا رونے لگتی ؟

یوسف :۔ کیوں بدشگونی کے الفاظ مُنہ سے نکالتے ہو ۔ رونے کا ، پریشانی کا ، فراق کا دور ختم ہوگیا ـــــ اب فجرِ نو طلوع ہورہا ہے

اور یہ ہے مسرت کا ـــــ ہنسنے کا ـــــ شادمانی کا ـــــ !

صالح :۔ ہاں اور کیا ـــــ لیکن یہ ہم لوگ آخر کہاں جارہے ہیں ـــــ ؟ کوئی منزل بھی متعین کرلی ہے ؟

یوسف :۔ ہاں ، ذرا اپنے باغ تک چلتے ہیں ـــــ کچھ دیر وہاں بیٹھیں گے ۔ ـــــ پھر آجائیں گے ۔

صالح :۔ چلو ـــــ واقعی وہاں کے پُر فضا منظر سے طبیعت بہل جائے گی ۔

یوسف :۔ طبیعت بہل جائے گی ، کیا معنی ؟ ـــــ کچھ گھبرا رہے ہو ؟

صالح :۔ ہاں، کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے ——— تشویش کی کوئی بات نہیں ——— یہ ہوتا ہی رہتا ہے ۔

یوسف :۔ کب سے؟

صالح :۔ مرض عشق کی ابتدا اور انتہا دونوں کی علامت یہی ہے ۔

یوسف ہنسنے لگا ۔

اتنے میں شہر کی جامع مسجد قریب آگئی ۔

یوسف نے کہا ۔

دیکھو کتنی خوب صورت مسجد ہے !

صالح :۔ ہاں بہت زیادہ ——— جب اِدھر سے گزرتا ہوں دل اس طرف خود بخود کھنچتا ہے ۔

یوسف :۔ کبھی نماز بھی پڑھی ہے یہاں ؟

صالح :۔ بارہا ——— اور ہر مرتبہ ایک خاص لذّت محسوس کی کیوں نہ ہو آخر یہ مسجد جن لوگوں نے بنائی ہے ۔ ان کا تقویٰ ، ان کی دین داری ان کی اسلامیت تک کون پہنچ سکتا ہے ۔

یوسف :۔ سچ کہتے ہو میرے دوست ——— لو اذان کی آواز آرہی ہے ۔ چلو پہلے یہاں نماز پڑھ لیں ، پھر آگے چلیں گے ۔

صالح :۔ باغ بھی اب کتنی دور رہ گیا ہے ۔ چلو زمین پر پڑھ لیں گے ۔

یوسف :۔ سبحان اللہ ۔ ابھی تو یہاں کے کیف و لذّت کی داستانیں بیان ہو رہی تھیں ، اب وقت آیا تو کترانے لگے ۔

صالح :— بات یہ ہے کہ آج مشہور واعظ عون بن جعفر کا وعظ ہے، پھر تم کہو گے ذرا وعظ بھی سُن لیں۔

یوسف :— (اشتیاق کے ساتھ) ہاں تو کیا ہوا، نماز پڑھ کر وعظ بھی سُن لیں گے۔

صالح :— پھر کہو گے اب باغ چلو ——— اور پھر میں باغ واغ جاؤں گا نہیں۔

یوسف :— وجہ؟ سبب؟

صالح :— مجھے سلمیٰ کے پاس جانا ہے۔ اس سے باتیں کرنی ہیں ——— تم تو ابھی اس نعمت سے محروم ہو۔

یوسف :— ہاں میں محروم ہوں، لیکن تمھیں محروم نہیں رکھوں گا۔ وعظ کے بعد تم سلمیٰ کے ہاں چلے جانا۔ میں گھر واپس چلا جاؤں گا۔

صالح :— ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں ——— لیکن گھر جاکر میرے بارے میں اگر پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہو گے؟

یوسف :— کہہ دوں گا، وہ حضرت مجھے دروازے تک پہنچا کر خود سلمیٰ کے ہاں چلے گئے۔

صالح :— تو میں نہیں جاتا ——— کہنا مجھے نہیں معلوم۔

یوسف :— اچھا یہی کہہ دوں گا۔ آؤ تو ———!

اب مسجد کا دروازہ آچکا تھا۔ دونوں مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ اور نماز میں شریک ہو گئے۔

---

(۳۵)

آگ

یوں بھی اس مسجد میں بہت کافی نمازی آتے ہیں۔ لیکن آج تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کیونکہ عمران بن جعفر کا وعظ سُننے کا ہر شخص کو اشتیاق تھا۔

نماز کے بعد عمران بن جعفر نے تقریر شروع کی۔

تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، لیکن اسلام کا رشتہ چھوڑتے جا رہے ہو اسلام تمہارا مذہب ہے۔ لیکن اسلام کے احکامات تعلیمات سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کہتا ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ داعی اسلام رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد تھا۔ تم مسلمان نہیں ہو سکتے جب اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرو، جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ تم میں نفاق ہے۔ عداوت ہے، خود غرضی ہے، بتاؤ کیا آج بھی تم میں زورِ حیدرؓ

اور فقر بوذر موجود ہے۔ کیا آج بھی تم میں ایثار اور قربانی کی روح کام کر رہی ہے؟ اگر نہیں، تو سوچو، آخر تم میں اور اسلام میں کیا نسبت ہے؟

تقریر ابھی جاری تھی کہ ساری مسجد میں ایک افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی بھگدڑ سی مچ گئی۔ اور شور بلند ہونے لگا۔

ایک پکار

"آگ، آگ، آگ!!"

دوسرے نے کہا۔

"بھاگو، بھاگو، مسجد میں آگ لگ گئی۔"

اتنے میں چٹاخ پٹاخ کی آوازیں آنے لگیں۔ مسجد کی چھت نے بھی آگ پکڑ لی لکڑیوں اور شہتیروں کے کڑکنے سے ایک عجیب بھیانک قسم کی دہشت ناک آواز پیدا ہونے لگی۔

کچھ لوگ دوڑے اور پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر آگ پر پھینکنے لگے۔ لیکن شدّت کی آگ کہیں پانی کے ان قطروں سے بجھتی ہے؟ اس کا زور اور بڑھتا گیا—— یہاں تک کہ مسجد کا بڑا حصّہ جل کر خاکستر ہو گیا۔

ایک آدمی نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

"شاید ہماری رواداری کو کمزوری سمجھ لیا گیا ہے"۔

اس مجمع میں یوسف بھی تھا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم اپنے مذہب اور مقاماتِ مقدسہ کی یہ توہین نہیں برداشت کر سکتے——

ہم انتقام لیں گے۔ یہ ہماری رواداری کی انتہا تھی کہ مسجد کے پہلو میں ہم نے گرجا بنانے کی اجازت دی۔ لیکن اگر ہماری رواداری کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسجد جلادی گئی تو یہ گرجا بھی نہیں رہے گا۔

صالح نے لاکھ لاکھ یوسف کا دامن پکڑ کر جھٹکا۔ اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ اس کی پُرجوش تقریر جاری رہی اور اس پرجوش تقریر نے سارے مجمع کو مشتعل کر دیا۔ اور بپھرا ہوا مجمع یوسف کی قیادت میں جس کا ساتھ نادل ناخواستہ صالح بھی دے رہا تھا۔ گرجا کی طرف بڑھا اور اُن کی آن میں گرجا بھی شعلوں کی لپیٹ میں گیا۔

یوسف نے کہا۔ "ہم نے انتقام لے لیا۔"

صالح نے کہا۔ "لیکن یہ بہت بُرا ہوا مجھے اس کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔"

یوسف:۔ تم احمق ہو، بزدل ہو۔ کم ہمت ہو۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اسی طرح ان بددماغ عیسائیوں کا دماغ ٹھیک ہوگا۔

اتنے میں پولیس آگئی۔ بہت سے لوگ بھاگ گئے، جو نہ بھاگ سکے وہ پولیس کے گھیرے میں لے لیے گئے۔

نیا حاکم جب سے آیا تھا۔ سارے شہر کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔ ہر طرف اُس کے جاسوس لگے رہتے تھے، اور رتی رتی کی خبریں اسے پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی پولیس آئی اُس نے سب کو گرفتار کر لیا۔ پولیس افسر نے اپنے ایک آدمی سے جو اس مجمع میں ملا ہوا تھا۔ دریافت کیا۔

"آگ کس نے لگائی؟"

وہ بولا "بہتوں نے۔ لیکن گھیرے میں جو لیے گئے ہیں یہ سب شریک تھے اس کارِ خیر میں" پھر وہ ہنسا

پولیس افسر نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا: "میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آگ لگانے پر لوگوں کو آمادہ کس نے کیا؟"

اُس نے یوسف کی طرف اشارہ کر دیا۔

پولیس افسر نیا نیا آیا تھا۔ وہ یوسف کو پہچانتا نہ تھا۔ پھر رات کا وقت تھا۔ اُس نے یوسف کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ حرکت تم نے کی تھی؟"

قبل اس کے کہ یوسف باصالح کچھ کہیں، پولیس افسر، یوسف وغیرہ کو لیکر اپنے جاسوس کے ساتھ دارالامارۃ کی طرف روانہ ہوا اور ساتھیوں سے کہتا گیا کہ وہ باقی ماندہ لوگوں کو لے کر پیچھے پیچھے آئیں۔

امیر کو پہلے ہی خبر مل چکی تھی، وہ غصہ میں بھرا ہوا بیٹھا تھا۔ اتنے میں پولیس افسر یوسف وغیرہ کو لے کر پہنچا اور پھر فوراً ہی دوسرے گرفتار شدگان پہنچ گئے۔

پولیس افسر اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔

امیر: — تم کیا خبر لائے؟

پولیس افسر: — مجرمین کو گرفتار کر لایا۔

امیر: — یہ سب اسلام کے مجرم ہیں۔ اسلام ظلم سے منع کرتا ہے۔ انھوں نے ظلم کیا۔ انھوں نے قانون توڑا۔ انھوں نے بدگمانی کی، انھوں نے عیسائیوں کے گرجا میں آگ لگائی جس کا ہم اسلام کے حکم سے ذمہ لے چکے تھے۔ اسلام

غیر مذاہب کی عبادت گاہوں کے احترام کا حکم دیتا ہے انھوں نے یوں احترام کیا کہ آگ لگا دی گرجا میں۔

پولیس افسر:۔ یا امیر آپ نے بالکل سچ فرمایا۔

امیر:۔ (گرج کر) میں تم سے اپنی تائید نہیں چاہتا۔

پولیس افسر:۔ مجرم حاضر ہیں۔

امیر:۔ میں ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا ـــــ جو لوگ ترغیب جرم اور اشتعال انگیزی کے مجرم ہوں انھیں کوڑوں کی سزا دی جائے۔ جو آگ لگانے کے مجرم ہوں اُن کی گردن مار دی جائے۔

پولیس افسر:۔ (سہم کر) گردن مار دی جائے۔؟

امیر:۔ ہاں کیا تمھارا دل کانپ رہا ہے؟

پولیس افسر:۔ میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہوں۔

امیر:۔ میں عبرت انگیز سزا کا قائل ہوں۔ میری بارگاہ سے کوئی رعایت کا تحفہ نہیں لے سکتا۔

پولیس افسر:۔ جانتا ہوں یا امیر!

امیر:۔ کیا اس مجمع میں تمھارے جاسوس تھے؟

پولیس افسر:۔ تھے یا امیر

امیر:۔ کم از کم وہ ان لوگوں کو تو ضرور پہچانتے ہوں گے۔ جنھوں نے آگ لگائی۔

پولیس افسر:۔ پہچانتے ہیں ـــــ اُنھیں کی نشان دہی پر میں نے گرفتاریاں

کی ہیں۔

امیر :۔ تو جاؤ ـــــ اسی وقت سب کو فیصلہ سُنا دو۔

پولیس افسر :۔ اور اسی وقت تعمیل

امیر :۔ نہیں۔ صبح ہوتے ہی جنھیں قتل کرنا ہے اُن کی گردن اُڑا دو۔ جنھیں کوڑے لگانے ہیں انھیں کیفرِ کردار کو پہنچا دو۔

امیر نے پردہ اٹھایا۔ اور حرم میں چلا گیا۔

---

(۳۶)

ایثار

پولیس افسر نے باہر آکر اپنے جاسوسوں سے شہادت لی۔ چند آدمی جن میں یوسف بھی تھا، آتش زنی کے مجرم قرار پائے۔ اُنھیں موت کی سزا کا حکم سُنا دیا، جو لوگ اشتعال انگیزی کے مجرم تھے۔ جن میں صالح بھی تھا، اُنھیں سزائے تازیانہ کا حکم سُنا دیا۔ سب کے گلوں میں سرخ اور سیاہ فیتے ڈال کر مجلس میں مقید کر دیا، اور کہا گیا، صبح اُٹھتے ہی تم لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاؤ گے۔

تمام قیدی ایک بڑے کمرے میں مقید تھے، یوسف اور صالح آمنے سامنے بیٹھے تھے ـــــ دونوں کے چہروں پر کیا کیفیت طاری تھی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ تقریباً اندھیرا تھا۔ مجلس میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا ـــــ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے، لیکن بالکل خاموش ـــــ! تھوڑی دیر بعد صالح نے زبان

کو جنبش دی ۔

"یوسف، یوسف!!

یوسف :۔ ہاں دوست ——— ! سُن رہا ہوں ۔ کہو ۔

صالح :۔ یہ کیا ہوا ؟

یوسف :۔ "شاید اسی لیے میرا دل دھڑک رہا تھا ——— آہ میری بیکس اور بے سہارا ماں ——— وہ رونے لگا ۔

صالح :۔ صرف ماں ——— ؟ رملہ نہیں ؟ کیا اس کی یاد نہیں آتی ہے ؟

یوسف :۔ آتی ہے ——— لیکن رملہ کو کوئی نہ کوئی شوہر مل جائے گا ۔ ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو کہاں سے پائے گی ——— ؟ صالح ! میں موت سے نہیں ڈرتا یہ آنسو بزدلی کے نہیں ۔ محبت کے ہیں ۔ تم دیکھو گے مردانہ وار میں موت کا مقابلہ کروں گا ۔ لیکن ماں کی یاد دل تڑپا دیتی ہے ۔ اس کی بیوگی کا سہارا ، زندگی کا ارمان صرف میں ہی تھا ۔

صالح :۔ کاش تم نے میری بات مان لی ہوتی ۔!

یوسف :۔ یہ نہ کہو صالح ——— میں اب بھی نادم نہیں ہوں ۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی ۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا ۔ جو کچھ میں نے کیا ۔ بہادری کے ساتھ اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں ۔ اس نئے امیر نے عیسائیوں کے حوصلے بہت بڑھا دیے ہیں مسجد میں آگ انہی نے لگائی ہے ۔

صالح :۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو ——— بہر حال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا !

یوسف :۔ تم رملہ کو سمجھانا اور میری ماں کو تسکین دینا ۔ کہیں وہ یہ خبر سُن کر مر نہ گئی ہو ۔

وہ پھر رونے لگا۔

صالح :۔ نہیں۔ وہ بہادر بیوی ہیں۔ وہ زندہ رہیں گی۔

دونوں خاموش ہو گئے ——— تھوڑی دیر کے بعد صالح نے کہا۔

"یوسف! ذرا اپنا فیتہ دکھانا۔"

یوسف نے فیتہ اُتار کر صالح کو دے دیا اور کہا

دیکھو اس کی سرخی سے اس اندھیرے میں بھی خون ٹپک رہا ہے۔"

صالح :۔ ہاں ——— اسے لیتے ہوئے ہاتھ کانپتا ہے۔

یوسف :۔ (ہنس کر) میں اب راضی برضا ہوں۔ نہ ہاتھ کانپتا ہے نہ دل۔

صالح :۔ واقعی بڑے بہادر ہو تم

یوسف نے وہ فیتہ پھر لے کر گلے میں ڈال لیا۔

صبح ہوئی۔ ہلکی ہلکی روشنی اس مجلس میں بھی پہنچی۔

دفعتہً یوسف چیخا ——— "ہائیں یہ کیا؟ ——— تم نے غلطی سے میرا فیتہ خود پہن لیا، اپنا مجھے دے دیا۔

صالح :۔ ہاں ——— یہ اب میرے ہی پاس رہے گا!

یوسف :۔ کیا میرے بجائے تم قتل ہونا چاہتے ہو؟

صالح :۔ (پر وقار انداز میں) ہاں ———!

یوسف :۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

صالح :۔ یہ ہو کر رہے گا ——— تم اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ تم قتل ہو گئے تو بوڑھی سکینہ کا کلیجہ پھٹ جائے گا ——— میرے کئی بھائی ہیں، بہنیں ہیں۔

میرا غم والدین برداشت کرلیں گے۔

یوسف :۔ اور سلمیٰ ۔۔۔؟

صالح :۔ اُسے کوئی اچھا شوہر مل جائے گا

یوسف :۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔

اتنے میں مجلس کا دروازہ کھلا ۔ داروغہ مجلس نمودار ہوا۔ اُس نے کہا۔ "صبح ہو گئی، وقت آگیا، چلو ۔۔۔ جلّاد تمھارا منتظر ہے

یوسف :۔ ہاں چلو۔ لیکن قتل کی سزا مجھے ملی ہے، میرے ساتھی کو نہیں۔

صالح :۔ نہیں یہ میرا پرانا دوست ہے ۔ یہ نہیں چاہتا کہ میں موت کے گھاٹ اتارا جاؤں، یہ میرے بجائے خود قتل ہونا چاہتا ہے ۔ لیکن میری غیرت اسے کب گوارا کر سکتی ہے ۔

داروغہ :۔ (ہنس کر) بیوقوف، پاگل ہو گیا ہے ۔ شاید بھلا کوئی دوسرے کے لیے بھی اپنی جان دیتا ہے۔

یوسف :۔ ہاں، یہ دے رہا ہے ۔

داروغہ :۔ تو مرنے دو اسے ۔ تم تو بچ گئے!

یوسف :۔ نہیں ۔ وہ نہیں مرے گا، میں مروں گا ۔

داروغہ :۔ ہم کچھ نہیں جانتے ۔ امیر نے پولیس افسر کو، پولیس افسر نے ہمیں، ہم نے جلاد کو جو حکم دیا ہے ۔ اُس کی تعمیل ہوگی ۔ جس کی گردن میں لال فیتہ ہے اُس کی گردن مار دی جائے گی ۔ جس کی گردن میں کالا فیتہ ہے اُس پر کوڑے پڑیں گے ۔

سب لوگ باہر لاکر ایک چبوترہ پر بٹھا دیئے گئے۔ اور تعمیل حکم شروع ہوگئی۔ جلاد کے ایک وار نے صالح کی گردن اُڑا دی۔ قتل ہونے سے پہلے صالح نے کہا

یوسف! اب جان لیا تم نے دوستی کیا چیز ہوتی ہے؟

پھر اُس کے قتل کے بعد جلاد نے کوڑے لگانا شروع کیے۔ کوڑے کی سزا یوسف نے بڑے استقلال سے برداشت کی۔ آخری کوڑے پر اُس نے کہا۔

جلاد! کاش تیرے ہاتھ میں دُرّے کے بجائے تلوار ہوتی۔

سزائے تازیانہ کے بعد ابراہیم بھی پہنچ گیا۔ یوسف نے گلوگیر آواز میں اُس سے کہا۔

"بچا جان ـــــ! صالح نے اپنی زندگی مجھ پر قربان کر دی"!

ابراہیم نے باوقار آواز میں کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ داروغۂ مجلس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بیٹے! مجھے تیرے بچ جانے کی خوشی ہے۔

یوسف:۔ اور ـــــ اور ـــــ صالح

ابراہیم:۔ اس پر مجھے فخر ہے۔

پھر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اور وہ یوسف کو سہارا دیتا ہوا باہر لایا۔

GOVT. ... No. 3926/703 Date 27.11.65 ... KARACHI